ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

اپریل ۲۰۱۶ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	خزاں رسیدہ انسانیت کے ساتھ اللہ کا فیصلہ	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۲۔	اداریہ	تنگ نظری ایک مہلک مرض	مدیر ۳
۳۔	خاص تحریر	تعاون ورواداری-اجتماعی کامیابی کا راستہ	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ۷
۴۔	قند مکرر	حکمت واعتدال-اور-موجودہ صورتحال	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۹
۵۔	پیام سیرت	کیا رسول اللہ ﷺ ہم سے خوش ہیں؟؟	محمد فرید حبیب ندوی ۱۶
۶۔	بحث و تحقیق	روضۂ رسول کا مقام-کتاب وسنت کی روشنی میں	محمد تبریز عالم قاسمی ۱۸
۷۔	// //	رسول رحمت ﷺ کے گھوڑے	عبدالستار خان ۲۷
۸۔	خصائص و امتیازات	امت محمدیہ کی خصوصیات وامتیازات (قسط-۲)	محمد قمر الزماں ندوی ۳۳
۹۔	اسلامی تعلیمات	صالح معاشرے کی تشکیل اور تعلیمات نبویؐ	ظفر دارک قاسمی ۳۹
۱۰۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۴)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۴۶
۱۱۔	نقطۂ نظر	اپریل فول کی حقیقت	محمد سلمان دہلوی ۵۰
۱۲۔	// //	نہ کر تقدیر کا شکوہ.....	محمد سراج الہدی ندوی ازہری ۵۲
۱۳۔	نقد ونظر	راشد شاز-ایک مطالعہ (قسط-۲)	مولانا الیاس نعمانی ندوی ۵۴
۱۴۔	ھندو ادبیات	قدیم ہندو ادبیات میں آنحضرت کا تذکرہ	ابوذر شیبان استھانوی ۵۷
۱۵۔	آخری صفحہ	قدیم اساتذہ کی شفقت وایثار	م-ق-ن- ۶۳
۱۶۔	شعروادب	رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی	علامہ اقبالؒ

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

تنگ نظری ایک مہلک مرض

تنگ نظری ایک ایسا مہلک مرض ہے جو انسان کو گھلا دیتا ہے، زندگی کو مضمحل کر دیتا ہے، باہم تعاون کے جذبہ کو سرد کر دیتا ہے، لہلہاتے سبزہ زاروں کو خشک کر دیتا ہے، تحریکیں پژمردگی وانتشار کا شکار ہو جایا کرتی ہیں، ادارے ترقی کی پٹری سے اتر جاتے ہیں، معاشرہ انجانے اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے، تنگ نظری کے سبب کبھی اپنے عیوب پر نظر نہیں جاتی، دوسروں کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہوتی ہے لیکن اپنی اصلاح کا خیال کبھی نہیں آتا، یہ مرض انسان کو بے جا خود اعتمادی میں مبتلا کر دیتا ہے اور اپنے ہی حصار میں مقید کر دیتا ہے، اس کے برخلاف قلب ونظر کی وسعت دشمن کو دوست بناتی ہے، فکر وعمل کی راہیں ہموار کرتی ہے، دعوت کے راستے استوار کرتی ہے، باہمی اتحاد کو جنم دیتی ہے، بے شمار مفاسد واختلافات کے لئے سدّ سکندری بن جاتی ہے، خارزاروں کو سبزہ زاروں کا مزاج عطا کرتی ہے، قلب ونظر کی وسعت سے انسان دلوں کو فتح کرتا ہے، اس کی عطا کردہ خود اعتمادی تسلیم ورضا کے حسین امتزاج کے ساتھ ایک خوشگوار فضا پیدا کرتی ہے، ایسی فضا جس میں ہر شخص سانس لینے میں فرحت محسوس کرتا ہے۔

تنگ نظری کے اسباب میں نمایاں سبب اختلاف یا عصبیت ہے، عصبیت خاندانی بھی ہوتی ہے اور علاقائی بھی، رنگ و نسل اور فکر ومسلک بھی عصبیت کو جنم دیتے ہیں، حضور ﷺ نے تمام طرح کی عصبیات کو اپنے قدموں سے مسل دیا تھا اور صرف تقوی کو افضلیت کا معیار قرار دیا تھا، ایک موقع پر ایک انصاری اور مہاجر میں ادنی سی بات پر کچھ جھگڑا ہو گیا دونوں نے اپنی اپنی جماعت کو مدد کے لئے پکارا، قریب تھا کہ دونوں کے حامی باہم برسر پیکار ہو جاتے کہ معاملہ کی اطلاع نبی کریم کو ہوئی آپ تشریف لائے اور آپ نے فرمایا مابال دعوى الجاهلية (یعنی یہ جاہلیت کا نعرہ کیسا ہے) مزید فرمایا دعوها فانها منتنه (اس نعرہ کو چھوڑ دو یہ بدبودار نعرہ ہے)، اسلام نے تمام طرح کی عصبیتوں کو ختم کر کے صرف دوقومی نظریہ دیا اور وطنی ونسبی قومیت کی بنیاد پر تعاون وتناصر کو کفر وجاھلیت کا نعرہ قرار دیا، فرمایا ہے هو الذى خلقكم فمنكم كافر ومنكم مؤمن والله بما تعملون بصير (تغابن ۲) گویا دنیا میں آنے سے قبل پوری انسانی برادری ایک اکائی تھی، جیسا کہ حدیث میں ہے كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه أو ينصرانه لیکن پھر انسان کسبی واختیاری طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا إنا هديناه السبيل إما شاكرا وإما كفورا، اور کفر واسلام کی دو برادریاں وجود میں آ گئیں، بس یہی ایک تقسیم ہے جو روا ہے، اس کے علاوہ کسی تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں چہ جائیکہ اس بنا پر فیصلے کیے جانے لگیں، اور تعاون وتناصر کا سلسلہ شروع ہو جائے اور اسی کی مسابقت ہونے لگے، آج پورے عالم اسلام میں یہ مرض ایک وبا کی طرح عام ہو گیا ہے اور ہمارا ملک اس میں پیش پیش ہے، اس

قبیح عمل میں دینداروں اور دنیاداروں کی کوئی تمیز نہیں رہ گئی ہے، اس عصبیت کے نتیجہ میں امانت و دیانت کا جنازہ اٹھتا ہے، صدق و صفا کا دم گھٹتا ہے، حکمت و مصلحت کے نام پر غیر علمی پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں، اہل و نااہل کی تمیز ختم کردی جاتی ہے، ترقی کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں، زبان قال سے نہیں تو زبان حال سے ہر مدعی بنی اسرائیل کے اس نعرے کا ثبوت دیتا ہے نحن أبناء الله واحباءه افسوس ہے کہ ایسے موقع پر یہ لوگ ان صریح ارشادات کو بھلا دیتے ہیں وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن اکرمکم عند الله اتقاکم اور لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی.....

دوسری چیز جس نے اس دور میں تعصب کو بہت عام کردیا ہے اور بالخصوص ہمارے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کو جماعتوں اور گروپوں میں تقسیم کرکے باہمی تعاون اور اتحاد کی راہیں مسدود کردی ہیں وہ فکر و مسلک کا اختلاف ہے، خوش گمانیاں اور خوش بیانیاں اگر حقیقت کے پیمانے پر پرکھی جائیں تو نتائج بڑے تلخ ہوں گے، کہنے کو تو برائے نام باہمی تعاون بھی ہے اور اتحاد کے ''پرفریب'' مظاہر بھی، لیکن فی الحقیقت ملت اسلامیہ ہندیہ جماعتوں، تنظیموں اور چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم ہے، شخص پرستی، تحزب اور تفرقہ اور اپنے اپنے حلقہ کو وسعت دینے کی فکر نے امت کو کمزور اور کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے، اس کے سبب پیدا ہونے والی تنگ نظری نے جو ستم ڈھایا ہے اور جس طرح لوگوں کو توڑا اور علحدگی پسند بنایا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

تعصب کی اس قسم کا یہ عالم ہے کہ نام اسلام کی تبلیغ کا لیا جاتا ہے اور بیان دوسروں کی تنقیص کی جاتی ہے، اس تعصب نے علم و فکر کی راہوں کو مسدود کردیا ہے، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو کند کردیا ہے، بولنا تو جرم ہے، اپنے کام، اپنے نقطۂ نظر اور اپنے افکار کی افادیت کی ترویج و اشاعت میں قطعی کوئی حرج نہیں لیکن دوسروں کی کوششوں کو نہ سراہنا، ان کو کوئی کریڈٹ نہ دینا، کسی کے کام کا اعتراف نہ کرنا بلکہ دوسروں کے نقائص بیان کرکے اپنی افادیت ثابت کرنا انتہائی خطرناک اور مہلک مرض ہے، دیکھا گیا ہے کہ اصول میں کوئی اختلاف نہیں لیکن محض ادنیٰ سے نظری، فکری اور فروعی اختلاف کے سبب تنگ نظری اور مخالفتوں کے ایسے مظاہرے ہوتے ہیں کہ عقل حیران اور علم ششدر رہ جاتا ہے، علمی و فکری اختلاف ہر دور میں رہا ہے، لیکن اس صورت میں صحابہ کرام کا تعامل اور متقدمین اہل علم و فضل کے باہمی تعاون اور عملی رویوں کو دیکھنا چاہیے (جن کے بیان کا یہ موقع نہیں) وہاں ادنی اختلاف کبھی مخالفت کا سبب نہیں بنتا تھا، ہمارے اس دور زوال کا یہ بدترین المیہ ہے کہ محض چھوٹے چھوٹے فکری اختلافات کے سبب ملت جماعتوں بلکہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم ہوکر رہ گئی ہے، ہر شخص کسی نہ کسی فکر اور کسی شخص سے وابستہ ہے اور اسی کی افادیت بیان کرنا گویا اس کا شعار اور وظیفۂ زندگی ہے، اسی کی بنیاد پر مخالفتوں کے طوفان کھڑے کردیے جاتے ہیں، ایک دوسرے کے درمیان دوریاں پیدا ہوجاتی ہیں، بدگمانیاں پھیلتی ہیں، بے کار و ناکارہ افراد محض تملق و چاپلوسی، غیبت اور کان بھر بھر کے اپنے کام نکالنے اور ملت کے تابوت میں کیلیں ٹھوکنے کا کام کرتے ہیں، اب تو یہ مرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ کوئی کسی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، ہر شخص (الا ماشاء اللہ) صرف ایسے افراد سے راضی ہے جو اس کے فکر و نظر کی توسیع کرے، اصول تو یہ ہے کہ جو طریقۂ کار بھی قرآن و سنت سے مستفاد ہو اس کے مطابق کام کرنے والوں کے درمیان باہمی تعاون کا جذبہ ہو اور سب

ایک دوسرے کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کام کریں، یہی تعلیم ہے قرآن مجید کی وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان لیکن صورت حال ایسی خطرناک ہوگئی ہے کہ اثم وعدوان کے علمبرداروں سے تو دوستی ممکن ہے مگر بر وتقوی کی راہ پر چلنے والوں سے صرف فکر ونظر کے اختلاف کے باعث مومنانہ ومخلصانہ تعلق مفقود ہوگیا ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندوی ''محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار واعادے میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں'' حضرت امام شافعی نے کیا خوب فرمایا ہے ۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلة

ولکن عین السخط تبدی المساویا

راقم نے اپنے ایک رسالہ کے پیش لفظ میں لکھا تھا، ''یہ بات مسلم ہے کہ ہر شخصیت کے اگر کچھ چاہنے والے ہوتے ہیں تو کچھ افراد شخصیت کشی پر آمادہ ہوتے ہیں، اول الذکر اپنی محبوب شخصیت کو معصوم سمجھتے ہوئے اس کی ہر لغزش ونقص کو بھی تقدس کی نظر سے دیکھتا ہے اور مبالغہ کی حدیں پار کر جاتا ہے، جبکہ ثانی الذکر بال کی کھال نکالتا ہے اور درگزر سے گویا اسے بیر ہوتا ہے، اسی کے نتیجہ میں نظریاتی اختلافات ایک فکری کشمکش بلکہ معاندانہ منافرت میں بدل جاتے ہیں۔''

یہ طرز عمل کسی صورت میں بھی جائز نہیں، اس کے سبب جس تنگ نظری نے جنم لیا ہے اس نے آج معاشرے کو حصوں بخروں میں تقسیم کر دیا ہے، فکری ونظری تنظیم سے اوپر ہر حال میں ملی ودینی غیرت ہونی چاہیے، اگر ایسا ہو تو یہ روح اسلام کے بھی عین مطابق ہوگا اور ملت بھی اس سے مستفید ہوگی، پھر عدل ونصاف بھی قائم ہوگا، باہمی تعاون اور امانت کا بھی چلن ہوگا، اور اس خطرناک صورت حال پر قابو پایا جاسکے گا جس نے اندر ہی اندر ملت کو کھوکھلا کر دیا ہے، یہ احساس صرف میرا نہیں، بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں، لیکن بعض کو اس احساس سے تکلیف ہوتی ہے تو بعض اسی احساس کے ساتھ جینے کو مقصد زندگی بنا بیٹھے ہیں، تنگ نظری کے اس مرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھی جائے اور دوسروں کے محاسن کو سراہا جائے، خود احتسابی کی عادت ڈالی جائے اور خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس زندہ ومستحضر رہے، تمام طرح کی خاندانی، لسانی اور علاقائی عصبیات سے بالا ہو کر اعتدال وتوازن کی راہ اپنائی جائے۔

بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا ہے کہ ملی کاز کے لیے کوشاں افراد اور فریضہ دعوت کو انجام دینے والوں میں نہ صرف باہمی ربط وتعاون کی کمی ہے بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے کی مخالفت ہے، خواہ یہ مخالفت عصبیت کی کسی بھی قسم سے ہو لیکن اپنی افادیت کے ثبوت اور اپنے نظریہ کی تبلیغ کے لیے دوسروں کی تنقیص اچھی اچھی مجلسوں کا پر لطف مشغلہ ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں افراد ٹوٹتے ہیں، ملت بکھرتی ہے اور اجتماعیت کمزور ہوتی ہے، ادارے اور تحریکیں رجال کار سے محروم ہو جاتی ہیں۔

اگر مقصود ملی کاز، کار دعوت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے تو پھر آپسی تعصب ومنافرت اور دوسروں کی تحقیر وتنقیص کے کوئی معنی

نہیں، پھر تو قرآنی اصول کے مطابق سب کے درمیان اس وقت تک باہمی تعاون وتناصر اور ربط وتعلق ہونا چاہیے جب تک کہ بات کفر وفسق اور زیغ وضلال تک نہ پہنچ جائے کہ یہاں پہنچ کر فراخ دلی کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

قرآن مجید کی سورہ تغابن میں ازواج واولاد کی بابت کہا گیا کہ کبھی کبھی یہ تمہیں دینی فرائض وواجبات سے روکنے کے سبب دشمنوں والا عمل کرتی ہیں، چنانچہ اگر یہ ایسا عمل کریں تو انہیں دشمن سمجھو اور ان سے بچو، قرآن نے عدوا لکم فاحذروھم کے الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس آیت کے خاص مخاطبین جو لوگ تھے جب انہوں نے آئندہ ایسے موقع پر کچھ تشدد کا ارادہ کیا تو قرآن نے کہا وإن تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان الله غفور رحيم اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ اگر اہل وعیال سے کوئی کام خلاف شرع بھی ہو جائے تو ان سے بیزار ہو جانا، بغض رکھنا اور ان کے لیے بد دعا کرنا مناسب نہیں ان سے عفو ودرگزر اور انہیں بخش دینے کی تعلیم دی گئی ہے جبکہ وہ توبہ کر لیں اور باز آجائیں، یہ بات اس لئے نقل کی گئی کہ خلاف شرع عمل پر تو رب العزت نے یہ گنجائش رکھی اور ربط وتعلق اور تنبیہ ودرگزر کی تعلیم دی۔ پھر یہ کس طرح روا ہے کہ محض علمی و فکری اختلافات کی بنا پر تعلقات برقرار نہ رہیں بلکہ مخالفتوں کے بازار گرم ہوں اور منافرتوں کی بھٹیاں سلگائی جائیں، دعوت کے بے شمار طریقے ہیں، دعوت حکمت کی بھی متقاضی ہے، ترغیب وترہیب آمیز خطابات کی بھی، کبھی قرآنی جدل وڈائیلاگ اور اتمام حجت کی ضرورت پڑتی ہے تو کبھی ذرائع ابلاغ کی، کردار دعوتی وسائل میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، جہاد بھی ذریعہ دعوت ہے، تربیت وتعلیم، علمی نظریات اور علمی اکتشافات، تالیف وتصنیف وتحقیق سے بھی داعی کا گہرا تعلق ہوتا ہے، تزکیہ نفس وتزکیہ اعمال، مساجد میں دروس کے حلقے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام، لوگوں تک چل کر جانا اور انہیں اللہ کی طرف بلانا یہ سب دعوت کے ذرائع ہیں، ان ذرائع کے استعمال میں عقل کے استعمال کا اہتمام بذات خود بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اب ان میں سے کوئی شخص اپنی سہولت وذوق کے اعتبار سے جس طریقہ سے بھی وابستہ ہو اور اس کی نیت خالص ہو تو اسے دوسرے طرق سے وابستہ افراد سے ربط وتعلق اور تعاون کا سلسلہ استوار رکھنا چاہیے، یہی اس کے اخلاص کی دلیل ہے اور یہی اسوۂ حسنہ کی جامعیت کا مطالبہ ہے، ہمارے زمانے کے کمزور افراد اگر سیرت طیبہ کی جامعیت پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے تو کم از کم وہ ان کے پیش نظر تو ہر حال میں رہنی چاہیے، اگر وہ پیش نظر رہے تو یقیناً یہ تعصّبات ختم ہو جائیں گے اور معاشرے میں اسلام کے جامع نظام کے نفوذ میں سب آپس میں ایک دوسرے کے معاون بن جائیں گے اور جزئیات پر محنت تقسیم کے بجائے امت کو تقویت پہنچانے کا باعث ہوگی اور اس طرح تنگ نظری کا خاتمہ ہو جائے گا جس نے آج دلوں کو بغض وحسد اور مخالفت کے جذبات سے بھر دیا ہے اور افراد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ بقول شاعر ؎

آشفتہ سری نہ تو درد جگری نے
برباد کیا تجھ کو تری کم نظری نے

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

خاص تحریر

تعاون ورواداری-اجتماعی کامیابی کا راستہ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے اپنے دل میں وسعت اور اس کے معاملہ میں رواداری اور لحاظ کا رویہ اختیار کرے، اس سے محبت کے ساتھ پیش آئے، اس کا جو اجتماعی اور اخلاقی حق ہے اس کو پورا کرے، اس سے رائے کا اتفاق ہو تو ظاہر ہے کہ دونوں میں توافق و یکجہتی خود بخود پیدا ہوگی، لیکن اگر رائے کا اختلاف ہے تو پھر اس کی ضرورت ہے کہ رواداری برداشت اور لحاظ کا معاملہ اختیار کیا جائے اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے حق اخوت کی ادائیگی کا امتحان ہوتا ہے۔ مسلمان کو اس سلسلہ کی ہدایت اور رہنمائی اس کے مذہب اور علم الاخلاق دونوں کی طرف سے ملی ہے، اور دیگر قوموں کے افراد نے صرف علم و مطالعہ سے ان اخلاقیات کی ضرورت محسوس کی ہے، لیکن مسلمان اس کے باوجود اس سلسلہ میں کمزور اور کوتاہ ہیں، اور ترقی یافتہ قومیں اپنی اجتماعی زندگی کی ان اخلاقیات پر خاصی حد تک عامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم کو ان ترقی یافتہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں نظم و توافق کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں، اور ان کی اس خصوصیت کی بنا پر ان قوموں میں اجتماعی یکجہتی اور نظم و ضبط کا بڑا اظہار ہوتا ہے اور یہ ان کی دنیاوی کامیابی کا بڑا راز ہے۔

اس کے برعکس مشرق کی ترقی پذیر قوموں میں اور خاص طور پر مسلمان ملکوں اور ان کے معاشروں میں ایسی پراگندگی، انتشار و اختلاف نظر آتا ہے کہ دیکھنے والا محسوس کر سکتا ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن ہیں، اور صرف کسی دباؤ و مجبوری کی بنا پر اکٹھا رہتے ہیں، لیکن ان کے دل و دماغ ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں، کیوں کہ جہاں چار آدمی اکٹھا ہوئے اور انہوں نے کسی کام کے سلسلہ میں تعاون کا منصوبہ بنایا تو تھوڑی ہی مدت میں ان میں اختلاف شروع ہو جاتا ہے، جو بعض وقت کھلے تصادم تک پہنچ جاتا ہے، اور پھر کم از کم ایک دوسرے سے علیحدگی پر ختم ہوتا ہے، یہ وہ مرض ہے جس نے مسلمان معاشروں کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے، اس کی ایک وجہ تو خود رائی اور خود پسندی ہے جو ایک عام مرض کی طرح مشرقی معاشروں اور مسلمانوں میں پھیل چکی ہے، دوسرے اپنے ذاتی فائدوں کو اجتماعی اور قومی فائدے پر ترجیح دینے کی کمزوری ہے، جو ایک طرح سے عام مزاج بنتی جا رہی ہے، ہر شخص اپنی رائے کو صرف صحیح ہی نہیں سمجھتا بلکہ آخری حد تک صحیح سمجھتا ہے، پھر اس سے مختلف رائے خواہ قریبی دوست کی طرف سے یا اس کے ہمسر اور ساتھی کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو لائق توجہ نہیں سمجھتا، اسی طرح اگر کسی معاملہ میں کوئی ذاتی مفاد ہو تو اس کے حصول کی خاطر اجتماعی اصول، اخلاقی تقاضا، اور قومی مصلحت سب کو نظر انداز کر دیتا ہے، یہ بات زندگی کے اکثر معاملات میں ہوتی ہے، خواہ

وہ عام دنیاوی معاملات ہوں یا اخلاقی دینی اور عام انسانی معاملات ہوں، خواہ اس کی وجہ سے اجتماعیت کا شیرازہ بکھرتا ہو، اور دو دوستوں، دو ہم مذہب بھائیوں، دو متفق المقصد ساتھیوں کے درمیان جدائی پیدا ہوتی ہو، چنانچہ مسلمانوں کی اجتماعی وحدتیں قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انتشار اور شکستگی کا شکار ہونے لگتی ہیں، اور ایک اتحاد کئی اتحادوں میں، ایک ادارہ کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے، اور پھر اس کے ٹکڑوں کے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ اجتماعی مرض صرف ان کے غیر تعلیم یافتہ طبقوں ہی میں نہیں بلکہ تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی یکساں طریقے سے پایا جاتا ہے، اور باوجود شعور کی بیداری کے اس میں کمی نہیں ہو رہی ہے، یہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے، جس کو مسلمان من حیث الافراد اور ان کی قیادتوں دونوں کو توجہ دینا چاہیے اور ملت کو اس کے نتائج بد سے بچانا چاہیے۔

خاص طور پر ملت اسلامیہ کی وہ اکائیاں جو سیاسی اور بین الاقوامی لحاظ سے کمزور حالت میں ہیں ان کو تو اس کی طرف بہت توجہ دینا چاہیے، ان کی جو صلاحتیں آج آپس میں دست وگریباں رہنے میں صرف ہو رہی ہیں ان صلاحتیوں سے وہ ملت کے افراد اور جماعت دونوں کو غیر معمولی فائدہ پہنچا سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو عموما افراد کی خودرائی اور ان کی ذاتی مصلحتوں کی طلب کے نتیجہ میں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں، اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور ان نقصانات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو ملت کو نیچے کر دیتے ہیں اور افراد کی متوقع ترقی کو بھی روک دیتے ہیں۔

اگر مسلمان اپنی اجتماعی زندگی میں برداشت کے اصول کو اپنا لیں تو مذکورہ بالا خرابی کی بہت کچھ روک تھام ہو سکتی ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا ہمسر اور برابر کا صرف اپنی زبان ہی سے نہ سمجھے بلکہ عمل سے بھی سمجھے، اس کی مصلحت کو اپنی مصلحت کے مساوی سمجھے، اگر دونوں کی رایوں میں یا مصلحتوں میں کہیں اختلاف رائے ہو تو اس کو خوش اسلوبی سے حل کرے، یا ایک کو دوسرے پر نہ ترجیح دے، بلکہ اس پر افتراق ومخاصمت کی نوبت حتی الوسع نہ آنے دے، اگر اس کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی سیرت سے رہنمائی حاصل کی جائے تو بہت اصلاح اور بہتری پیدا ہو سکتی ہے اور پھر ملت صرف ترقی ہی نہیں کرے گی بلکہ اس کی نیک نامی اور اچھی شہرت بھی ہوگی، اور ملت کی ترقی اور شہرت کا فائدہ ملت کے افراد کو پہنچے گا۔

غزوۂ احد میں حضور ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، یا مدینہ سے نکل کر دشمن کو باہر ہی سے روکا جائے اور شکست دی جائے، تو مختلف رائے آئیں، حضور ﷺ نے اپنی رائے کو نظر انداز کر کے اپنے اصحاب کی رائے پر باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا ارادہ فرمالیا اور تیاری مکمل کر لی، بعض کی رائے پھر یہ ہوئی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، تب آپؐ نے فرمایا کہ یہ مناسب نہیں کہ طے کر لینے کے بعد پھر تغیر کیا جائے، اب یہی رائے ٹھیک ہے۔

دیگر موقعوں پر حضور ﷺ نے قابل مشورہ باتوں میں متعدد بار اپنی رائے پر اپنے صحابہ کی رائے کو ترجیح دی، لیکن جب وحی الٰہی سے یا اندرونی یقین واعتماد سے کسی بات کا آپ نے فیصلہ فرمایا تو اس میں خواہ تمام صحابہ مختلف رائے رکھتے ہوں آپ ﷺ نے اپنی رائے پر ہی عمل فرمایا جس کی مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔

اجتماعی زندگی کا تقاضا تعاون اور رواداری سے چلتا ہے کہ ہم دوسرے کی بات کو اگر قبول نہ کر سکیں تو بہر حال اس کی مخالفت اور عداوت نہ شروع کر دیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو محبت اور تعاون کی فضا ہی کو برقرار رکھیں، اس سے اجتماعی اتحاد واتفاق باقی رہتا ہے اور ملت کامیابی کے راستہ پر چلتی ہے۔

☆☆☆

قند مکرر

حکمت واعتدال-اور-موجودہ صورت حال

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عالم عربی کی موجودہ صورت حال کچھ ایسی کربناک داستان بنتی جارہی ہے کہ حساس آدمی اس سے اپنے آپ کو الگ رکھنا بھی چاہے تو ناممکن ہے! ہولناک مناظر اور خطرناک حقائق کے ساتھ تکلیف دہ خبریں اور خون رلانے والے منظر نامے بسا اوقات ہاتھ سے لقمہ گرادیتے ہیں، دنیا میں ایسے غیوروں اور سر فروشوں کی ایک جماعت ہر دور میں رہتی ہے جو ایمان فروش اور عقل سے عاری لوگوں کا مقابلہ کرتی ہے، یہ اعتراض کرنا تو بالکل فضول ہے کہ ان کی تعداد کم ہے یا ایسے لوگ اپنے موقف میں تنہا نظر آتے ہیں کیونکہ قدیم عربی شاعر نے کہا ہے

تعيرنا انا قليل عديدنا
فقلت لها إن الكرام قليل

(ہماری تعداد کی قلت پر تو مجھے عار دلاتی ہے، یاد رکھ کہ شرفاء کی تعداد کم ہی ہوتی ہے)

سچ اور حق کا ساتھ دینے والے، کشتیاں جلانے کا جذبہ رکھنے والے مومنانہ فراست اور حکمت ایمانی سے سرشار ہو کر حق کی تائید اور حق کا اعلان کرنے والے ہمیشہ کم رہے ہیں، اس وقت ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ ایمان ونفاق کی تفریق کا پیمانہ بن گیا ہے، ایک طرف کھلا ہوا حق ہے اور دوسری طرف اژدھا ہے جو بار بار ڈس رہا ہے اور ایسے ایسے کاری زخم لگا رہا ہے کہ اسلام کا جسم لہولہان ہے، مگر تفو بر تو اے چرخ دوراں تفو!

کیا کیجئے اس ظالم دنیا کا جو تقریبا مصلحت پسند یا باطل پرست ہو چکی ہے، موجودہ صورت حال نے دنیا کے ہر خطہ میں نہ صرف اداروں کو بلکہ گھروں کو تقسیم کر کے رکھ دیا ہے، باپ کا نظریہ کچھ ہے، بیٹا کچھ کہتا ہے، بیوی کسی اور کی حمایت کرتی ہے، بھائی کسی اور کے ساتھ کھڑے ہیں، حق نظر آنے کے بعد بھی نظروں سے اوجھل ہے، لیکن فی الحقیقت اگر بصارت کے ساتھ بصیرت بھی کارفرما ہو اور جذبۂ ایمانی مہمیز کرے تو حق ہر طرح واضح ہے، حق کو سمجھنا، حق بولنا، حق کی حمایت کرنا تب ہی ممکن ہے جب حکمت واعتدال کے معانی احقاق حق اور ابطال باطل سمجھے جائیں اور نفاق و مصلحت پسندی اور مجاملت و مداھنت کو حکمت قرآنی اور اعتدال کا نام نہ دیا جائے، ہر مومن کی ڈھڑکن رہنے والے ملک سعودی عرب اور اس کے کارندوں اور احسان شناسوں نے حد کر دی کہ اب تو زبانوں پر تالے ڈالنا شروع کر دیا، دہشت گردانہ قانون، سیاسی انارکی یا دولت کی ریل پیل، کسی بھی ذریعہ سے صحیح لیکن وہ زبانوں کو بند کر دینا چاہتے ہیں اور قلم کو خشک کر دینے پر آمادہ ہیں، ایسے ہی

حالات کے لئے عربی کے ایک شاعر نے کہا۔

كيف باسادتي يغني المغني
بعد ما خيطوا له شفتيه

(جناب والا کیسے کوئی مغنی نغمہ گائے کہ ان ظالموں نے تو اس کے ہونٹ سی دیے ہیں)

ایک طرف غم کی نہ رکنے والی آندھی، اس کی تایید کرنے والے اور ظلم کی حمایت میں مسابقہ کرنے والے لوگ، دوسری طرف دولت کی ریل پیل، خرید و فروخت کا منافقانہ عمل، مفادات کی دنیا، دنیا کی ہریالی، ذاتی مفادات، چھوٹی چھوٹی نوکریوں کی لالچ، یومیہ راتب کے مسائل، اپنی اوقات سے زیادہ مل جانے کی خواہش و امید، سودے بازیاں اور بلیک میلنگ حق کو نظروں سے اوجھل کیے ہوئے ہے اور حق کی تایید سے گریز پر آمادہ کر رکھا ہے، ظالم کے ساتھ کھڑے ہونے میں مسابقہ آرائی ہے، ایسا علم جس کا مطمح نظر صرف دنیاوی زندگی کی مصلحتیں ہوں یا ایسا فہم دین جو حق کے واضح ہونے کے باوجود اس کی مخالفت پر محض اس لیے آمادہ نہ کرے کہ اس کے پیچھے ذاتی مفاد یا غیر ایمانی جذبہ کارفرما ہو تو اس فہم دین اور اس علم پر قرآن کا یہ تبصرہ بہت بھرپور ہے ولم يرد الا الحيلة الدنيا ذلك مبلغهم من العلم (نجم ۲۹-۳۰)

تاریخ کی شہادت ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں ہمیشہ کچھ دیوانے اور حق کے متوالے اپنا ضمیر بیچنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اپنی ایمانی جرأت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں، ان سے خاموش تماشائی بھی نہیں رہا جاتا چہ جائیکہ وہ غلط موقف اختیار کریں، وہ تو صاف صاف اعلان کرتے ہیں حق کی حمایت کا، اور پھر قرآن کا تو صریح حکم ہے، آخر جب ظالم کی مکمل شناخت ہو جائے اور وہ کھل کر سامنے آجائے کیا تب بھی اس حکم کا نفاذ نہ ہوگا ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار ومالكم من دون الله من اولياء ثم لا تنصرون (ھود ۱۰۶) (ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی وسرپرست نہ مل سکے گا جو تم کو خدا سے بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی)

الحر يأبى أن يبيع ضميره
بجميع ما في الأرض أموال

بندھا ہوا ہوں اصولوں کی ڈور سے
ورنہ، ضمیر بیچ کے میں بھی امیر ہوں

اب تو حق بالکل واضح ہو گیا، باطل اور اس کے پرستار کھل کر سامنے آگئے، اب بھی اگر حق کی تایید سے اعراض کیا جائے تو پھر قرآن کا یہ تبصرہ صحیح ہوگا کہ قرآن کی آیات میں یہ لوگ غور ہی نہیں کرتے،

سعودی عرب کی حکومت سے کسی کو کیا دشمنی، امارات کے حکمرانوں سے کسی کی کوئی شخصی دشمنی نہیں، لیکن ان کی خارجہ پالیسی جو سراسر اسلام دشمنی پر مبنی ہے اس سے ہر صاحب ایمان کو عداوت ونفرت ہے، اس کی تاریخ بہت پرانی ہے ۱۹۱۶ میں خلافت عثمانیہ کی قبا چاک کرنے کے لئے حکمرانِ عرب نے جو معاہدہ کیا تھا جس سے خلافت عثمانیہ ان کی اس غداری کے سبب ختم ہوگئی تھی، اس پر حضرت اقبال نے اس طرح ایک تلخ تبصرہ کیا تھا:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

لیکن اب تو انتہا کر دی، عرب کے ان بزدل، عیش پسند اور جاہل حکمرانوں نے اپنے پورے وجود کو امریکہ و اسرائیل کا رہین منت بنا لیا، اسی کے اشارے پر ان کی زندگی کی گاڑی چلتی ہے، واہ ری اسلام دشمنی!! ملت کی دولت اور اس سے

اسلام کی سرکوبی!! پہلے سعودیہ وامارات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ربیع عربی یا عرب بہاریہ کو ناکام بنانے میں، پھر مصر میں اخوانی حکومت کا قلع قمع کرنے کے لئے اور صہیونی مفادات کے حصول اور تخت وتاج کی حفاظت کے لئے اربہا ارب کی دولت قربان کردی، نماز پڑھتے ہوئے لوگوں اور روزہ داروں کا قتل عام کرایا، مسجدوں میں آگ لگوائی زبانوں پر تالے ڈلوائے، شریفوں، ایمان داروں اور حق کے علمبرداروں کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے پر مجبور کیا اور حد یہ کہ مصر کو معنوی اعتبار سے اسرائیل میں ضم کر دیا، اہل غزہ پر دائرۂ حیات تنگ کیا جانے لگا ان پر پانی بھی ظالموں نے بند کر دیا، دوا وغذا کا رونا کیا!! بچے تو اب وہاں پانی کو ترسنے لگے، اس پر بھی ان شاہان عرب نے چین کی سانس نہ لی بلکہ مصر میں اسلام پسندوں کے لئے دائرہ حیات تنگ کر دینے والے اور اسلام مخالف قانون کا تالیاں بجا کر عرب بادشاہوں نے استقبال کیا، امریکہ کی ایک جھوٹی دھمکی پر جو اس نے مصری فوج کے جبر وتشدد پر اقتصادی تعاون نہ کرنے کی دی، اسی کے ایک پٹھو نے کمال دیدہ دلیری سے کہا کہ ''امریکہ اگر تعاون نہیں کرے گا تو ہم کریں گے'' اسی پر اکتفا نہیں کی گئی تمام اسلامی مزاحمتی تنظیموں بشمول فلسطین و شام ومصر کی الاخوان، حماس اور جبہۃ النصرۃ وغیرہ کو دہشت گرد قرار دیا گیا، بھول گئے یہ دیوانے کہ سعودیہ کے مفتی اعظم بن باز رحمہ اللہ نے اخوان کو حق کے سب سے قریب جماعتوں اور تحریکوں میں شمار کیا، اخوانیوں کی کتابیں داخل نصاب تھیں بلکہ سعودیہ کا پورا تعلیمی ڈھانچہ اخوان کا رہین منت ہے، سعودیہ نے جس تنظیم کے ذریعہ اپنے مفادات کا نفاذ کیا وہ رابطہ عالم اسلامی بھی ان ہی کے افکار کی مرہون منت ہے،

کس قدر ماتم کیا جائے ان نام نہاد ومعدود چند لوگوں پر جو حقائق کو مسخ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، جو اخوان وحماس اور دیگر اسلامی تنظیموں کو گمراہ بتاتے ہیں اور محض اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے وہ رات کو دن اور سیاہ کو سفید بتا کر ان کی محبتوں اور تاثیر کو کم کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، ان کے علم کا مبلغ قرآن کی اصطلاح میں یہی ہے لیکن ان پر افسوس بھی نہیں۔

عرب حکمرانوں کی اسلام دشمنی کی یہ داستان از ماضی تا حال بہت طویل ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ساری زندگی تڑپ تڑپ کر اس صورت حال کی اصلاح کی فکر میں گھلتے رہے، ان پر ان کی سازشیں کارکردگی اور طرز عمل سب عیاں تھا، ان کی تقریریں اور تحریریں ان کی مادیت پسندی، عیش کوشی اور فکری گمراہی پر تنقید یا اصلاحی تنقید سے لبریز ہیں، وہ علامہ اقبال کا وہ لہجہ تو اختیار نہ کر سکے جو اوپر مذکور ہوا، لیکن علامہ اقبال کے ہی اس اشارے کو موضوع بنایا جو کہ ان کی ساری داخلی وخارجی سیاست، دینی وفکری صورت حال پر کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی

حضرت مولانا نے تو ۱۹۵۰ میں یہ کہہ دیا تھا کہ مسلمانان عالم کا قبلہ مکہ ہے لیکن اہل مکہ کا قبلہ امریکہ ہے، اس وقت کے ولی عہد مملکت کے لئے جو خط لکھا تھا، اس کا تذکرہ کرنے کے بعد کہ معلوم ہوا وہ پڑھ کر سنایا گیا یوں افسوس وحسرت کا اظہار کرتے ہیں:

''کاش کہ اس خط کا کوئی عملی نتیجہ نکلتا، اور اس وقت سے راستہ کی تبدیلی کی کوششیں کی جاتی تو آج نہ صرف مملکت سعودیہ بلکہ عالم اسلام کی صورت حال بہت مختلف ہوتی''
(کاروان زندگی ج ا ص ۳۴۱)

خط ۱۹۵۰ کا اور یہ اظہار حسرت کاروان زندگی کی پہلی جلد کی تصنیف کے وقت جس کے درمیان تقریبا ۳۲ سال کا وقفہ ہے کیونکہ کاروان زندگی کی پہلی جلد کی تصنیف مولانا نے دسمبر ۱۹۸۲ میں شروع کی، مولانا نے ساری زندگی جو موقف اختیار کیا یعنی تجدید واصلاح کے لئے ''شیخ سرہندی کا موقف'' کہ دعوت کے ذریعہ اہل حکومت کی اصلاح کی جائے اس پر عمل کیا، موقع تفصیل کا نہیں لیکن راقم کی کتاب مفکر اسلام ایک مطالعہ میں جا بجا اور اس کے مقدمہ میں خاص طور پر ان کے ایسے اقدامات اور صراحتیں مذکور ہیں، جو ان کی حق شناسی، حق کی تایید، حق گوئی میں صراحت کی غماز ہیں، بلکہ ان کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے ہمیشہ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں کی حمایت کی خواہ وہ کسی بھی نظریہ اور موقف کے حامل ہوں، نظریات انسانی ہیں، ان میں کمی بیشی ممکن ہے لیکن اگر وہ کتاب وسنت کے مخالف نہیں تو پھر صرف اپنے نظریات کے خول میں اس طرح کیوں قید ہوا جائے یا مصلحت پسندی کا سہارا کیوں لیا جائے کہ شبہات ستانے لگیں، کوئی بھی انسانی موقف ابدی ودائمی نہیں اور اس پر عمل واجب بھی نہیں، حضرت مولانا کا ہمیشہ یہی طرز عمل رہا جب وہ کچھ نہ کر پاتے تھے تو منکر کی نکیر ضرور کرتے تھے، اور ایک انسان سے یہی مطلوب ہے کہ وہ جو کچھ اپنی طاقت وحیثیت کے مطابق کر سکتا ہو حق کی سربلندی کے لئے وہ کر گزرے اور اس میں کسی مصلحت و ملامت کی پرواہ نہ کرے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں مفکر اسلامؒ-ایک مطالعہ)

ہمیں افسوس اس پر ہے کہ جب حق وباطل کی کشمکش اس درجہ انتہا کو پہنچ گئی ہو تو حکمت واعتدال کا بہت چرچہ ہوتا ہے، مجھے معاف کیا جائے اس تلخ نوائی کے لئے کہ حکمت واعتدال کے یہ الفاظ قرآنی حکمت و اعتدال نہیں، مصلحت ومجاملت اور بعض چھوٹے اور ایمان ویقین سے عاری اور علم سے نابلد لوگوں کے لئے مداہنت اور مفادات کے حصول کا ذریعہ ہیں، ورنہ حکمت کے معنی لسان العرب میں یہ ہیں کہ ''بہترین علوم کے ذریعہ اعلیٰ چیزوں کی پہچان'' عدل کے معنی بھی ہیں، تاج العروس میں حکمت کے معنی یوں ہیں کہ اشیاء کی حقیقت کو ان کی اصلیت کے مطابق جاننا اور علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا، اللہ غریق رحمت کرے مولانا فراہیؒ کو جنہوں نے حکمت کی خصوصیات ومعانی کو خوب خوب بیان کیا ہے، حق کو علم وعمل کے لحاظ سے درست قرار دینا حکمت ہے، امام جرجانی کہتے ہیں ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو حکمت کہلاتی ہے، امام اصفہانی علم اور عقل سے حق کی مطابقت کو حکمت قرار دیتے ہیں، رازی کے نزدیک قول وعمل کی درستی اور ہر شے کو اس کا درست مقام دینا حکمت ہے، قرآنی حکمت کے مفہوم میں یہ سب معانی داخل ہیں، حکمت کی تعلیم اسی لیے دی گئی ہے کہ آدمی حق شناس، حق گو اور حق کا حامی ہو، حق وباطل کو صحیح مقام دے سکے، صحیح اور غلط میں تفریق کر سکے، ملت کے مفاد اور اپنے مفاد کو درست مقام دے سکے، رہی بات اعتدال کی تو اس کی تحقیق بھی یہی ہے کہ ہر وہ بات جو افراط وتفریط سے پاک ہو، درمیانی راستہ، وسطیت یا اور کوئی تعبیر جو اس کی تشریح کرتی ہو، لیکن یہ یاد رکھا جائے کہ اعتدال عدل سے ہے اور عدل ہوگا تبھی افراط وتفریط سے نجات مل سکے گی، لسان العرب میں اس کے ایک معنی درست و سیدھا کرنے کے ہیں جس کے ضمن میں حضرت عمر کا یہ مقولہ نقل کیا ہے "الحمدلله الذی جعلنی فی قوم إذا ملت عدلونی کما یعدل السهم فی الثقاف" ای قوموني آگے اور لکھا ہے عدلت الشئ فاعتدل أی سوّیته فاستوی۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حکمت کا وہ کون سا مفہوم ہے

جواس کی اجازت دیتا ہے کہ ایمان وکفر، حق وباطل، صہیونیت و اسلامیت کی کشمکش میں واضح طور پر ظالم کا ساتھ دیا جائے یا ظالم کی حمایت کرنے والوں کے ساتھ کھڑا ہوا جائے، یا ان کی تایید میں بیانات دیے جائیں یا کوئی اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے، حکمت واعتدال تو یہی ہے کہ ہر حال میں حق پر ثابت قدم ہوا جائے، اس کے اظہار کے طریقے تو مختلف ہو سکتے ہیں، انداز واسالیب کی نوعیت الگ الگ ہوسکتی ہے لیکن حق گوئی او رحق کی حمایت سے تنازل نہ قرآنی حکمتِ دعوت ہے، اور نہ اسلام کا مطلوب اعتدال، اور باطل کا ساتھ دینے والوں، اس کے حامیوں اور اس کو قوت فراہم کرنے والوں کی حمایت کرنا یا ان کی مدح وستائش کرنا خواہ کسی مجبوری میں ہی کیوں نہ ہو کسی طرح بھی حکمتِ دعوت، حکمت اسلام اور اعتدال کے مطابق نہیں، حکمت قرآن بھی حق اور حق کی تایید و موافقت چاہتی ہے، اعتدال بھی انصاف چاہتا ہے، عدل کا تقاضہ کرتا ہے، حق کا ساتھ نہ دیا جائے، اور خاموشی اختیار کی جائے تو ممکن ہے کہ کوئی گرفت نہ ہو لیکن ایسے اقدامات جس سے حق کے بجائے باطل کی تایید ہو یا اس سے برأت ظاہر ہو تو یہ بصیرت وفراست مومن کے بھی منافی ہے اور اسلام کے مطلوب معتدل مزاج کے بھی مفافی ہے، اس انداز کو کبھی بھی کسی تاریخی شخصیت کے موقف سے نہیں جوڑا جاسکتا،

ہمیں جس ادارے سے وابستگی کا موقع میسر آیا اور جہاں ہم نے دوحرف لکھنا پڑھنا سیکھا اس کا مسلک اعتدال اور ایک مقصد رفع نزاع باہمی ہے، جس کے لئے ہمیشہ وہاں کے اساطین کوشاں وسرگرداں رہے، لیکن انہوں نے یہ خطا کبھی نہ کی کہ حق گوئی کے راستہ سے ہٹے ہوں اور اس کے لئے اس کا سہارا لیا ہو، حضرت مونگیریؒ کی کوششوں اور ان کے مناظروں سے کون واقف نہیں، علامہ شبلیؒ نے بلقان کی جنگ پر جو آنسو بہائے اور کانپور کے قتل عام پر جو ذہنی توانائی خرچ کی وہ کسی پر مخفی نہیں، سید الطائفہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیاسی بصیرت وسرگرمیاں اور ان کی تنقیدوں سے شذرات کا کون سا حصہ خالی ہے، ہر باطل تحریک ونظریہ کا تعاقب اور ہر صاحب حق کی تایید ان کا شیوہ تھا، پھر نمونۂ اسلاف ندوۃ العلماء کے گلِ سر سبد ثانی حضرت مفکر اسلامؒ تو اتحاد کی علامت بن گئے، اس لیے کہ ان کا اعتدال ان کو ہمیشہ حق گوئی پر آمادہ کرتا تھا، وہ ہمیشہ حکمت قرآنی کو ملحوظ رکھتے تھے اسی لئے اپنے خاص اسلوب میں حق وباطل کی تفریق کرتے تھے، حکمت واعتدال اور رفع نزاع باہمی کا ایسا ہی غلط یا غیر واضح مفہوم اس وقت بعض ذہنوں میں تھا جب حضرت مولانا نے ''دومتضاد تصویریں'' تصنیف کی، ان لوگوں کے اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے کہ یہ آپ کے کام و مقام اور مزاج کے خلاف ہے، ''کاروان زندگی'' میں جو کچھ تحریر کیا جی چاہتا ہے کہ اس کو نقل کروں جس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اعتدال کا صحیح مطلب انصاف ہے اور حکمت وہی ہوسکتی ہے جو حق کے موافق ہو، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''یہ کتاب اگر چہ متکلمانہ اور مناظرانہ طرز پر نہیں لکھی گئی تھی، اور اس میں ادبی اور تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لئے دل چسپی اور دل آویزی کا سامان بھی تھا، پھر بھی راقم کے ان چند دوستوں کو میرا اس موضوع پر قلم اٹھانا پسند نہیں آیا جو مجھے دین کا ایک مثبت وایجابی داعی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا مصنف اور مما لک عربیہ واسلامیہ کو دعوتِ اصلاح وانقلاب دینے والا اہلِ قلم سمجھتے تھے، چنانچہ کئی دوستوں نے اس پر اظہار حیرت کیا اور اپنی اس توقع کا اظہار کہ میں ایسے قدیم متنازع فیہ مسائل پر قلم اٹھانے کے بجائے جس پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، دعوتی

واصلاحی، تاریخی وادبی، اور اجتماعی ومعاشرتی موضوعات کے دائرہ میں اپنی مساعی اور تحریری کاوشوں کو محدود رکھوں گا، میں نے اس پر نہ اس وقت جب بعض حلقوں کی طرف سے اس پر سوال کیا گیا، ندامت کا اظہار کیا، اور نہ معذرت کا، اور نہ اس وقت نادم اور معذرت خواہ ہوں ''کاروان زندگی'' کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ میں نے اپنی ساری ادبی و تاریخی مشغولیتوں اور دل چسپیوں اور دعوتی و تصنیفی مشغولیتوں کے باوجود ۱۹۵۸ میں قادیانیت کے موضوع پر قلم اٹھایا، اور میری وہ کتاب اردو عربی اور انگریزی میں شائع ہوکر مقبول و مشہور ہوئی، اور وہ اس موضوع کی مقبول ومستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شیعیت وقادیانیت دونوں میں ختم نبوت کے انکار کی روح مشترک ہے، پھر جب اسلام کے سرحدی خط Line of Demarcation کو کوئی دعوت و تحریک یا فرقہ ومسلک پھلانگ جائے تو پھر ایک داعی اور مصنف واہل قلم کا رویہ اور طرز عمل (خواہ وہ کتنا ہی فراخ دل اور وسیع النظر ہو) سکوت اور غیر جانب داری سے ہٹ کر بے لاگ اظہار حق اور آزادانہ احتساب کی طرف ہوجانا چاہیے، امام ابوالحسن شعری، امام غزالی، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب تک سب کا طرز عمل یہی رہا ہے، ملیشیا اور انگلستان کے تازہ سفروں اور انڈونیشیا کے بعض علماء اور دین کے داعیوں کے خطوط نے اس کی توثیق کردی اور اس سلسلہ میں اطمینان پیدا کیا کہ فتنہ اتنا ہی شدید اور یہ مغالطہ (ان عناصر کے شامل ہوجانے کی وجہ سے جن کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے) اتنا ہی عمیق تھا کہ اس کا ناقدانہ جائزہ لینے اور دینی وعلمی احتساب کرنے کی ضرورت تھی، اور الحمدللہ کہ یہ کام اپنے وقت پر ہوا، اور اب بھی اس کی افادیت واہمیت باقی ہے کہ ایران کے انقلاب کی نوعیت اور جس خوں ریزی اور تشدد کے ساتھ رونما ہوا، پھر ایران وعراق کی مسلسل جنگ جس کو سات سال کی مدت ہورہی ہے، خلیج کی پوری پٹی کے لئے خطرہ، پھر اس سب سے بڑھ کر ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۷ء) کے حج کے موقعہ پر مکہ معظّمہ میں ایرانیوں کے جارحانہ مظاہرہ اور حرمین کے سلسلہ میں ان کے خطرناک منصوبہ نے (جس کو فی الحال ناکام بنادیا گیا) اس تنقید واحتساب کے کام کو جاری رکھنے اور ایران اور اس کی ذمہ دار حکومت کے اس رویہ کی تنقید کی ضرورت پیدا کردی ہے، جو عالم اسلام کے لئے خطرہ بن گیا ہے، اور جو اسلام کی تصویر غیر مسلموں کی نظر میں بگاڑنے اور اسلام اور تاریخ اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔'' (کاروان زندگی ج۳ ص۲۶۲)

جس طرح حضرت مولاناؒ نے اعتدال وحکمت کے ساتھ حرمین کے دفاع میں قلم اٹھایا اور اہل حرمین کی خبر لیتے رہے اگر آج بقید حیات ہوتے تو ان کا معتدل موقف اخوان کی تایید، سعودیہ کے اقدام کی تردید کرنے کے ساتھ غاصبینِ مصر کی خبر لیتا۔

اعتدال وحکمت کے صحیح معنی ومفہوم کو برتنے کے لیے فقہ الواقع جیسی نعمت کبریٰ کا حاصل ہونا بہت ضروری ہے، جس کا آج واقعی فقدان ہے، فقہ الواقع کی دولت ذاتی علم ومطالعہ اور اسفار ومشاہدات سے حاصل ہوتی ہے، اچھے خاصے لوگ متعدد اسباب کے سبب فقہ الواقع یکسر خالی ہوئے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب جبکہ حق بالکل واضح ہے اور موجودہ کشمکش کی خطرناکی ہر طرح صاف نظر آرہی ہے لیکن ہمارے مواقف واضح نہیں ہو پارہے ہیں، ابھی مصر کے ڈاکٹر سعد ابوالرضا تشریف لائے تھے ان سے اس موضوع پر بات ہونے لگی تو بڑا خوبصورت تبصرہ کیا جو مختصر اور جامع تھا، اور صحیح بھی یہی ہے کہ

کام کرنے کے طریقوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، نظریات میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن حق و باطل کی کشمکش کو سمجھنے اور حق کی نصرت کا اعلان کرنے، باطل سے براءت کا اظہار کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا، ہاں اس کے بھی اسالیب و انداز میں تنوع ممکن ہے، وہ کہنے لگے ''ہم اخوانی ہوں یا نہ ہوں لیکن اسلامی ضرور ہیں اور جو کچھ مصر میں ہوا وہ غیر شرعی اور غیر اسلامی تھا'' بات بہت سیدھی اور واضح ہے، سعودیہ ہو یا امارات یا دیگر طاقتیں جو اسلام پسندوں کے در پہ آزار ہیں خود ان کو اور ان کی حمایت کرنے والوں کو قرآن کا یہ اعلان یاد رکھنا چاہیے سیھزم الجمع ویولون الدبر (قمر ۴۵)

جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو ہم دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ امکانات ہیں اس سے ہم ناواقف نہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ اس پورے منظر نامے کے پیچھے صرف صہیونی اور امریکی مفادات ہیں جن کے حصول کے لئے خون مسلم کی ارزانی ہے، حرمین و حجاز کا تقدس اور اس کی حفاظت ہماری نظروں سے اوجھل نہیں، ہم اس خطرے سے خوب واقف ہیں لیکن یہ ایمان پختہ ہے کہ اس کی حفاظت ہر حال میں رب کریم فرمائے گا اور ضرورت پڑی تو ملت اسلامیہ کے سپوت اس کے لیے سپر بن جائیں گے، نہ جانے کتنے سفاکوں نے حرمین پر بری نظر ڈالی لیکن ان کو منہ کی کھانی پڑی، آل سعود اشارہ تو کر کے دیکھیں، جس جزیزۃ العرب کو یہود و نصاری اور شیعوں کی بستی بنانے میں وہ پیش پیش رہے ہیں، ان کے ایک اشارے پر مسلمانان عالم کس طرح دنیا سر پر اٹھائیں گے، ہم جانتے ہیں کہ جزیزۃ العرب پر فی الحقیقت امریکی سامراج کا قبضہ ہو چکا ہے اور اس میں بڑا رول ادا کیا ہے آل سعود نے حرمین کی حفاظت کو ہی آڑ بنا کر حجاز کو امریکی فوج کی چھاونی بنا دیا، لیکن قصہ مختصر یہی ہے کہ دنیا کو حکمت و اعتدال کے قرآنی مفہوم و مطالبہ پر جمع ہو کر حق کی تایید کرنی پڑے گی اور امریکی تسلط سے حرمین کی سرزمین کو نجات دلانے کے لئے حق گو علماء، حق گو ادارے اور حق کی حامی جماعتوں کو آگے آنا پڑے گا، سچ یہ ہے کہ اگر علماء حق (جیسا کہ پروفیسر محسن عثمانی نے لکھا تھا) سب مل کر بیک آواز عربوں کو تنبیہ کرتے تو صورت حال کچھ اور ہی ہوتی، اللہ کا شکر ہے کہ بات کئی حلقوں سے سامنے آنے لگی ہے، ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اپنے مضمون ''اخوان دہشت گرد نہیں ہیں'' اور پروفیسر محسن عثمانی صاحب اپنے مضمون ''جب عمرہ نہ کرنا عمرہ کرنے سے بہتر ہو جائے'' کے لئے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں، وہ اگر دستیاب ہو جائیں تو پڑھنا فائدے سے خالی نہیں، یہ سوچ کر خاموش ہو جانا کہ ہر جگہ حکومت تک پہنچنے کی خطا مسلمانوں نے کی اور یورپ کا عزم ہے کہ وہ کسی طور پر اسلامی نظام قائم نہیں ہونے دے گا، انتہائی غلط اور حق کو کمزور کرنے کی ایک بات ہے، سوال یہ ہے کہ کیا پھر یورپ کی اتباع کی جائے؟ ایک طویل عرصہ تقریبا ۷۰ سال کی دعوتی، اقتصادی تعلیمی اور سماجی محنت کے بعد یہ اقدامات کیے گئے جو کامیابی سے تقریبا ہمکنار ہونے والے تھے لیکن سچ یہ ہے کہ جس کو کہنا اور لکھنا مجبوری ہے کہ ان اسلام پسندوں کو یورپ نے نہیں بلکہ عرب شاہوں نے کامیاب نہ ہونے دیا، اس پر بہت سے بیانات اور خبریں گواہ ہیں، جن کا نام بہ نام تذکرہ مناسب نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ حقائق تواتر سے گزر کر وثوق تک پہنچ چکے ہیں، کیونکہ اسلامی نظام کے سایہ میں ان کو اپنا تخت سرکتا نظر آیا، اگر یہ اسلام سے محبت کرنے والوں کے ساتھ ہوتے تو یورپ کو بہت دیر لگتی بلکہ شاید ناکامی اس کا مقدر ہوتی مگر افسوس۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے۔

☆☆☆

بیام سیرت

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے خوش ہیں؟؟

محمد فرید حبیب ندوی
Email: 12fareedamu@gmail.com

کتنی پیاری اور محبت آمیز تھی وہ نگاہ!!

کیا ہی دلآویز اور جاذب و پرکشش تھی وہ نظر!!

آہ، وہ آخری نظر!! آخری نگاہ!! محبت بھری، پیار کے رس میں گھلی ہوئی!!

کیا نظارہ تھا وہ!! جس نے اس کے پژمردہ چہرے کو شگفتہ کر دیا تھا!!

بیماری و موت کی تکلیف کو فراموش کیے آج وہ مسکرا رہا تھا۔

ایسی مسکراہٹ جس کے پیچھے ایک طویل تاریخ چھپی تھی۔

ایسا تبسم جس کی سلوٹوں میں ایک انقلابی تاریخ پوشیدہ تھی۔

ایک طویل جدوجہد کے بعد اب آرام کرنا چاہتا تھا وہ۔

انسانیت کی فکرمندی نے اب تک اسے چین ہی نہ لینے دیا تھا۔

انسانیت کا غم اس طویل دور میں دیمک کی طرح اسے کھائے جا رہا تھا۔

اس طویل مدت میں ایک دن بھی ایسا نہ تھا جو اس نے سکون سے گذارا ہو۔

دن تو دن، ایک رات بھی وہ چین سے سو نہ سکا تھا۔

دن کے ہنگاموں میں، رات کے سناٹوں میں، بازار کے شور میں، گھر کی تنہائی میں، اسے ایک ہی فکر تھی، ایک ہی کڑھن تھی، اور ایک ہی تڑپ تھی۔

جب رات کی دبیز چادر دنیا پر پھیلی ہو، ہو کا عالم طاری ہو، انسانیت بستر استراحت پر متمکن ہو، تب بھی تنہا ہوتا تھا وہ!! .....دل غم سے چور.....آنکھیں اشکبار.....دماغ محو فکر۔

کتنے تکلیف دہ تھے یہ ۲۳ سال!!..... چور چور کر دینے والے.....خون کا ایک ایک قطرہ چوس لینے والے۔

وہ جو ہر وقت سوچتا ہی رہتا، متفکر و پریشان، بے چین و بے قرار۔

لیکن آج!! آج وہ مسکرا رہا تھا، ہنس رہا تھا، اس کا چہرہ دمک رہا تھا، ایک عجیب احساس تھا اس کی خوشی میں۔

بے پناہ کشش.....اور ..... بے پناہ جاذبیت تھی اس کی مسکراہٹ میں۔

دیکھنے والے بے قابو ہوئے جاتے تھے، قریب تھا کہ دل چاک کر لیتے۔

جانے کو تو وہ دنیا سے جا رہا تھا، دوست، اقرباء، اولاد، رشتہ دار سب اس سے چھوٹ رہے تھے۔

مگر پھر بھی آج خوشی سے نہال تھا وہ، احساس مسرت سے شاد کام تھا وہ، شاداں وفرحاں اور مطمئن تھا وہ!!

جیسے اس کی بوئی ہوئی کھیتی پک آئی ہو، اس کے لگائے ہوئے پودے آج ثمر آور ہو گئے ہوں، اس کی محنت رنگ لائی ہو۔

جی ہاں! ایسا ہی کچھ دیکھا تھا اس نے آج، ایسا نظارہ جس نے اسے خوشی دی تھی، اطمینان دیا تھا، مسکراہٹ دی تھی۔

آخر کیا دیکھا تھا اس نے؟؟

پہلے یہ تو پوچھو کہ وہ آیا کیوں تھا؟ اس کا مشن کیا تھا؟؟

وہ دنیا کے سب سے مشکل کام پر آیا تھا، سب سے کٹھن مشن لے کر آیا تھا۔

معلوم بھی ہے کیا تھا وہ مشن؟؟

وہ مشن تھا خدا اور بندہ کو ملانے کا، بندہ کا آقا سے رشتہ استوار کرنے کا۔

۲۳ سال سے یہی کام کر رہا تھا وہ۔ ان سالوں کا ایک ایک لمحہ مشغول تھا، ایک ایک ساعت مصروف تھی۔

اور آج جب اس نے زندگی کے آخری لمحات میں حجرۂ عائشہ کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی محنت رنگ لائی ہے، اس کے تربیت یافتہ نماز میں مشغول تھے، کتنا خشوع رہا ہوگا اس نماز میں جسے دیکھ کر اس امت کا نبی مسکرایا ہوگا!! کتنا اخلاص بھرا ہوگا اس عبادت میں جس نے اس کے نبی کی مشکل آسان کی ہوگی!!

دن ورات اسے یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ اس کی امت کا کیا ہوگا!! کہیں یہ اپنے خدا کو بھول تو نہیں جائے گی، کہیں یہ گمراہ تو نہ ہو جائے گی۔

مگر آج اس نے جب اپنی امت کو نماز میں مشغول دیکھا، ان کا ذوق عبادت اور شوق سجود دیکھا، ان کے اخلاص اور درد دل کا احساس کیا تو اب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کی امت اب کبھی گمراہ نہ ہونے پائے گی۔ اور پھر وہ چین سے چلا گیا، اس دنیا سے تشریف لے گیا، رفیق اعلی سے جا ملا، اور جاتے جاتے امت کو نماز کی اہمیت بتلا گیا، اور یہ کہہ کر گیا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے نماز.....اس کے دل کا سرور ہے نماز .....اور.....اس کی خوشی ہے نماز۔

اس طرح وہ اپنی امت کو حالت نماز میں چھوڑ کر گیا۔

مگر، ہائے افسوس! اے امت!

تو نے رسول کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے ساتھ کیا کیا؟؟

تو نے رسول کی خوشی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟؟

رسول اللہ ﷺ آج بھی اس نماز کے انتظار میں ہیں جو انہیں خوش کر سکے۔ فرشتے آج بھی آپ کو ہماری نمازوں کی خبر دے رہے ہیں۔

اور آپ چشم تصور سے ہمارا حال دیکھ رہے ہیں۔

ذرا سوچیے!! کیا ہم نے وہ نماز پڑھی جس سے ہمارا رسول خوش ہو؟؟

نماز کی وہ کیفیت تو دور رہی، ہم نے پنج وقتہ نمازوں کی پابندی بھی کی؟؟

اگر نہیں! تو پھر بتائیے کہ ہمارا رسول ہم سے کس طرح خوش ہوگا؟؟

☆☆☆

بحث و تحقیق

روضۂ رسول کا مقام - کتاب وسنت کی روشنی میں

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد
Email:mtalam800@gmail.com

آنجناب اپنی زندگی میں جس طرح تمام مسلمانوں کے لئے محبت واحترام کا قبلہ وکعبہ تھیاسی طرح آپ کی وفات کے بعد آپ کا روضہ اقدس دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے محبت واحترام کا قبلہ وکعبہ ہے، یہ ہمارے ایمان کا اٹوٹ حصہ ہے۔

روضۂ رسول کا مقام

رسول اللہ ﷺ کا اپنی قبر میں، بلکہ جملہ انبیاء کرام کا اپنی قبروں میں زندہ ہونا، جمہور امت کے متفقہ مسائل میں سے ہے اگر چہ حیات کی نوعیت میں فرق ہے، اس لئے مدینہ منورہ کی سرزمین کا وہ حصہ جو رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر اور اعضاء مبارکہ سے مس کررہا ہے، وہ پورے روئے زمین میں افضل ترین حصہ ہے، بلکہ قاضی عیاض مالکیؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ حصہ کعبہ سے بھی افضل ہے۔

روضۂ رسول کی زیارت کے فضائل

(۱) سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

تشریح: شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں: اس خصوصیت کی خاص وجہ ہے، کیونکہ جہاں تک حضور ﷺ کی شفاعت کا تعلق ہے اس نعمت سے ہر مسلمان کو نوازا جائے گا، اور آپ کی یہ کرم فرمائی اور مومن نوازی جملہ مسلمانوں کے لئے عام ہے، لیکن یہاں پر شفاعت سے مراد خاص شفاعت ہے جو درجہ خاص کے حصول کا ذریعہ ہوگی، ان کے علاوہ غیر زائرین کے لئے اپنے زیادتی اعمال اور کثرت فضائل کے باوجود اس درجہ پر پہنچنا میسر نہ ہوگا۔

آگے لکھتے ہیں:

اس کے علاوہ زائر کے لئے یہ بشارت بھی ہے کہ وہ دین اسلام پر مرے گا، یہ بھی سید انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکت کے طفیل ہوگا، وہ اس طرح کہ شفاعت کے لئے دین اسلام پر مرنا ضروری ہے۔ (جذب القلوب الی دیار المحبوب: ۲۵۸)

مولانا ظفر احمد تھانویؒ لکھتے ہیں: زائر کے لئے شفاعت کی جو بشارت ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی فضیلت ہوسکتی ہے۔

و أي فضيلة أعلىٰ و أسنى من وجوب شفاعته صلى الله عليه وسلم لمن زاره (اعلاء السنن: ۱۰:۲ ص: ۴۹۸)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے حج کیا اور اس کے بعد میری قبر کی زیارت کی میری وفات کے بعد تو وہ (زیارت کی سعادت حاصل کرنے میں) انہیں لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے میری حیات میں میری زیارت کی (شعب الایمان: فضل الحج والعمرۃ: ۳۸۵۷)

مولانا منظور نعمانیؒ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کا اپنی قبر مبارک میں بلکہ تمام انبیاء علیہم

السلام کا اپنی منور قبور میں زندہ ہونا جمہور امت کے مسلمات میں سے ہے، اگر چہ حیات کی نوعیت میں اختلاف ہے، اور روایات اور خواص امت کے تجربات سے یہ بھی ثابت ہے کہ جو امتی قبر پر حاضر ہو کر سلام عرض کرتے ہیں، آپ ان کا سلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں، ایسی صورت میں بعد وفات آپ کی قبر پر حاضر ہونا اور سلام عرض کرنا ایک طرح سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور بالمشافہ سلام کا شرف حاصل کرنے ہی کی ایک صورت ہے اور بلاشبہ ایسی سعادت ہے کہ اہل ایمان ہر قیمت پر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں'' (معارف الحدیث:۴/۴۵۸)

(۳) جس شخص نے مکہ کا قصد کیا اور پھر میری زیارت اور میری مسجد میں شرف حاضری کے حصول کا قصد کیا تو اس کے دو مقبول حج لکھے جاتے ہیں (جذب القلوب:۲۶۱)

فضائل زیارت روضہ رسول کے سلسلہ میں یہ تین روایتیں بطور نمونہ کے لکھی گئی ہیں، تفصیل کے لئے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی جذب القلوب کا مطالعہ کریں، جس میں انہوں نے اختصار کے ساتھ تیرہ روایات کو جمع کیا ہے، اگر چہ بعض روایات پر کلام بھی کیا گیا ہے، جن کے بارے میں مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کا تبصرہ ایک وقیع تبصرہ ہے، لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کے جن منافع اور برکات ومصالح کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اگر اس کو پیش نظر رکھ کے ان احادیث پر غور کیا جائے جو اس زیارت کی ترغیب میں مروی ہیں تو خواہ سند کے لحاظ سے ان پر کلام کیا جاسکے لیکن معنوی لحاظ سے وہ دین کے پورے فکری اور عملی نظام کے ساتھ بالکل مرتبط اور ہم آہنگ نظر آئیں گی اور ذہن سلیم اس پر مطمئن ہوجائے گا کہ قبر مبارک کی یہ زیارت، صاحب قبر کی ذات اقدس کے ساتھ ایمانی تعلق اور محبت وتوقیر میں اضافہ اور دینی ترقی کا خاص وسیلہ ہے، یقین ہے کہ ہر خوش نصیب، صاحب ایمان بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے زیارت کی سعادت سے بہرہ ور فرمایا ہے اس کی شہادت دے سکے گا۔ (معارف الحدیث: ج:۴ص:۴۵۹)

روضۂ رسول کی زیارت کا حکم

الأنبياء أحياء في قبورهم (مسند أبي يعلى: ۳۴۲۵)

انبیاء چونکہ اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں، موت ان کے لئے مُزیلِ حیات نہیں ہوتی؛ بلکہ ساترِ حیات ہوتی ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قبر اطہر میں باحیات ہیں؛ اس لئے زیارت قبر اطہر کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، انہیں روایات کے پیش نظر احناف کے یہاں زیارت روضہ اقدس کا حکم قریب بہ واجب ہے، جمہور کے نزدیک مستحب ہے اور بعض مالکیہ اور بعض ظاہریہ کے نزدیک واجب ہے اور ابن تیمیہ زیارت قبر اطہر کو غیر مشروع کہتے ہیں۔

و قد اختلف فيها أقوال أهل العلم، فذهب الجمهور إلى أنها مندوبة و ذهب بعض المالكية و بعض الظاهرية إلى أنها واجبة و قالت الحنيفة: إنها قريبة من الواجبات، و ذهب ابن تيمية الحنبلي إلى أنها غير مشروعة (حاشیۃ إعلاء السنن: ۱۰/۴۹۹) ملا علی قاریؒ نے شرح الشفاء میں قاضی عیاض مالکیؒ کے حوالے سے لکھا ہے: زيارة قبره عليه السلام سنة من سنن المسلمين مجمع عليها أي مجتمع على كونها سنة و فضيلة مرغب فيها۔ یعنی قبر اطہر کی زیارت مسلمانوں کی متفق علیہ سنت ہے اور اس کی ایسی فضیلت ہے جس کی رغبت ہر مسلمان کو کرنی چاہیے (شرح الشفاء:۲/۱۵۰)

لہٰذا ہر صاحب استطاعت شخص کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ اسے جب بھی موقع ملے گا وہ روضۂ اقدس کی زیارت کرے گا اور جو لوگ حج کرنے جاتے ہیں، انہیں روضہ اقدس کی زیارت بھی کرنی چاہیے، اگر چہ روضہ اقدس کی زیارت حج کا کوئی رکن یا جز

نہیں ہے؛ لیکن شروع سے امت کا یہ تعامل چلا آرہا ہے کہ خاص کر دور دراز علاقوں کے مسلمان جب حج کو جاتے ہیں تو روضہ پاک کی زیارت اور وہاں درود وسلام کی سعادت ضرور حاصل کرتے ہیں اور کسی سے اس کا انکار منقول نہیں ہے، تو یہ اجماع کے درجہ میں ہے، اعلاء السنن کے حاشیہ میں ہے:

لم يزل دأب المسلمين القاصدين للحج في جميع الأزمان على تباين الديار و اختلاف المذاهب، الوصول الى المدينة المشرفة لقصد زيارته صلى الله عليه وسلم ويعد ذلک من أفضل الأعمال، و لم ينقل أن أحدا أنكر عليهم ذلک فكان إجماعاً (إعلاء السنن: ۱۰/ ۴۹۹)

اور جن لوگوں نے زیارت قبر اطہر کو ممنوع ومکروہ لکھا ہے ان کے بارے میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ "الأحاديث فی هذا الباب كثيرة، وفضائل الزيارة شهيرة، و من أنكرها؛ إنما أنكر ما فيها من بدع نكيرة غالبها كبيرة" یعنی باب زیارت کی روایات بہت زیادہ ہیں، اس کے فضائل مشہور ہیں اور جس نے بھی اس کا انکار کیا ہے حقیقت میں اس نے ان بدعات و منکرات کا انکار کیا ہے، جن میں سے اکثر گناہ کبیرہ تک پہنچ جاتے ہیں (مرقاۃ المفاتیح، رقم الحدیث:۲۷۵۶، باب حرم المدینہ)

البتہ حاجیوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ پہلے حج مکمل کرلیں پھر زیارت کے لئے مدینہ جائیں، کیونکہ حج فرض ہے اور زیارت روضہ اقدس قریب بہ واجب ہے اور حق اللہ کی تقدیم مناسب بات ہے، البتہ حضرت حسنؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے بڑی اچھی بات نقل کی ہے کہ اگر حج فرض ہو تو حاجی کے لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے حج کرے پھر زیارت کرے، اگر چہ زیارت کی تقدیم میں کوئی گناہ نہیں، وہ بھی جائز ہے، اور اگر حج نفل ہو تو اسے اختیار ہے، جس سے چاہے آغاز کرے (دیکھیے: فتح القدیر:۳/۱۷۹ کتاب الحج)

روضۂ اقدس کی زیارت کے لئے سفر کا شرعی حکم: ابن تیمیہ رحمہ اللہ قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کو ناجائز کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرے پھر روضہ اقدس کی زیارت کرے، مستقل طور سے روضۂ اقدس کی نیت سے سفر نہ کرے؛ لیکن جمہور امت کے نزدیک قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا نہ صرف جائز ہے؛ بلکہ یہ اہم عبادتوں میں سے ہے اور بڑا کار ثواب ہے؛ کیونکہ روضہ اقدس کی زیارت کی فضیلت کے بارے میں روایات بہ کثرت وارد ہیں، دوسری بات یہ کہ پوری امت کا یہ تعامل چلا آرہا ہے کہ ہر حاجی مکہ کا ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑ کر چار سو میل طویل سفر کرکے مدینہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ حجاج صرف مسجد نبوی کی زیارت کے لئے نہیں جاتے؛ بلکہ ان کا مقصود روضہ اقدس پر حاضری ہوتی ہے اور تعامل ایک مستقل دلیل ہے، چنانچہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں۔

والأولى فيما يقع عند العبد الضعيف تجريد النية لزيارة قبر النبى صلى الله عليه وسلم و يوافق ظاهر ما ذكرناه من قوله عليه الصلوٰة والسلام، لا تعمله حاجة الا زيارتى، یعنی میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ خالص زیارت کی نیت کرے؛ کیونکہ حدیث لا تعمله حاجة الا زيارتى (کہ میری زیارت کے سوا کوئی حاجت اس کو نہ لائی ہو) کے ظاہر کے موافق ہے (فتح القدیر:۳/۱۸۰)

اور شیخ الحدیث مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے یہی علماء دیوبند کا مسلک بتایا ہے:

عندنا و عند مشائخنا زيارة قبر سيد المرسلين (روحى فداه) من أعظم القربات و أهم المثوبات و أنجح لنيل الدرجات بل قريبة من الواجبات، وإن كان حصوله بشد الرحال و بذل المهج و الأموال و ينوى

وقت الارتحال زيارة عليه الف الف تحية و سلام و ينوى معها زيارة مسجده صلى الله عليه وسلم

یعنی ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک زیارت قبر سید المرسلمین (ہماری جان آپ پر قربان) اعلیٰ درجہ کی قربت اور نہایت ثواب اور سبب حصول درجات ہے؛ بلکہ واجب کے قریب ہے، گوشدرحال اور بذل جان ومال سے نصیب ہو اور سفر کے وقت آپ کی زیارت کی نیت کرے اور ساتھ میں مسجد نبوی وغیرہ کی نیت کرے۔ (المہند علی المفند: ۲۷)

روضۂ اقدس پر دعاء مغفرت کی درخواست: چونکہ سرکار دوعالم رسول اللہ ﷺ اپنی قبر اطہر میں باحیات ہیں؛ اس لیے جیسے آنجناب کی زندگی میں ان سے دعاء مغفرت کی درخواست کرنا، سفارش کی درخواست کرنا اور استمداد جائز تھا، ویسے دنیا سے رخصت فرما جانے کے بعد بھی روضہ اقدس پر حاضر ہوکر درخواست کرنا جائز ہے؛ لہٰذا روضہ اقدس پر حاضری دینے والے یہ درخواست کر سکتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم سراپا گنہگار ہیں آپ بارگاہ خداوندی میں ہماری مغفرت کے لئے دعا فرمادیں۔ مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ نے آیت: و لو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما (النساء: ٦٤) کے ذریعہ اس مسئلہ کے جواز پر استدلال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوجائے اور آپ اس کے لئے دعائے مغفرت کردیں، اس کی مغفرت ضرور ہوجائے گی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حیات کے زمانہ میں ہوسکتی تھی اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے'' (معارف القرآن: ۴۵۹/۲)

اس سلسلہ کا ایک واقعہ پڑھیے: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کو دفن کرکے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا اور قبر شریف کے پاس آکر گرگیا، اور زار زار روتے ہوئے آیت: ولو انهم اذ ظلموا انفسهم الخ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوجائے اور رسول اللہ ﷺ اس کے لئے دعائے مغفرت کردیں تو اس کی مغفرت ہوجائے گی، اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، کہ آپ میرے لئے مغفرت کی دعا کریں، اس وقت جو لوگ حاضر تھے، ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے آواز آئی: قد غفر لك'' یعنی تیری مغفرت کردی گئی (البحر المحیط فی التفسیر: ۶۹۴/۳)

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سماع میں کسی کو خلاف (اختلاف) نہیں، اسی وجہ سے ان کو مستثنیٰ کیا ہے اور دلیل جواز یہ ہے کہ فقہاء نے بعد سلام کے وقت زیارت قبر مبارک کے شفاعت مغفرت کا عرض کرنا لکھا ہے؛ پس یہ جواز کے واسطے کافی ہے'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۱۳۴، ادارہ اسلامیات لاہور)

روضہ اقدس پر درود و سلام:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو کوئی بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر واپس کردیتے ہیں، یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دے دیتا ہوں (ابوداؤد، رقم الحدیث: ۲۰۴۱، باب زیارۃ القبور)

اس روایت میں اگرچہ روضہ اقدس کی قید نہیں ہے؛ لیکن سنن ابوداؤد کے مصنف نے یہ روایت باب زیارۃ القبور کے تحت ذکر کی ہے، جس کا مطلب ہے کہ یہاں حضور پر سلام سے مراد

زیارت روضہ اقدس کے وقت سلام کرنا ہے؛ چنانچہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے، جو شعب الایمان میں نقل کی گئی ہے، اس کے الفاظ ہیں:

ما من عبد يسلم علي عند قبري (شعب الإيمان: ۳۸۵۹، باب فضل الحج والعمرة)

اور درود کے سلسلہ میں روایات بھی بکثرت وارد ہیں، دیکھیے: (القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع)

بہرحال اللہ نے ایسا نظام بنایا ہے کہ آپ روضہ اقدس کے پاس سلام کریں تو سرکار دوعالم ﷺ خود سنتے ہیں اور اس کے سلام کا جواب وعلیک السلام کے ذریعہ دیتے ہیں، گویا ایک اعتبار سے روضہ اقدس پر سلام کرنے سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اگر یہ نعمت ساری دنیا بلکہ اس دنیا جیسی چار پانچ دنیا خرچ کر کے بھی حاصل ہو تو ایک امتی کے حق میں ارزاں اور سستی ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا مشاہدہ:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م: ۱۱۷۶ھ) قدس سرہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں مذکورہ حدیث کے تحت گفتگو کی ہے، خلاصہ درج ذیل ہے: ''روح پاک جو مشاہدہ حق میں مشغول ہے اور جس کا کسی طرف التفات باقی نہیں رہا، باذن الٰہی وہ سلام پیش کرنے والے کی طرف ملتفت ہوتی ہے اور جواب دیتی ہے، یعنی روح پاک سے سلام کرنے والے کو فیض پہنچتا ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں: میں نے ۱۱۴۴ھ میں جب میرا قیام مدینہ منورہ میں تھا، اس بات کا بار بار مشاہدہ کیا ہے یعنی روح نبوی سے فیض پایا ہے (رحمۃ اللہ الواسعہ: ۳۴۵/۴)

علامہ سخاویؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب: القول البدیع میں روضہ اقدس پر کئے جانے والے سلام کے تعلق سے کئی واقعات نقل کیے ہیں، چند ملاحظہ فرمائیں:

سلیمان ابن سحیمؒ سے منقول ہے کہ میں نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول جو لوگ آپ کے روضہ پر حاضر ہوتے ہیں اور آپ پر سلام کرتے ہیں، آپ اس کو سمجھتے ہیں؟ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا: ہاں سمجھتا ہوں، اور ان کے سلام کا جواب بھی دیتا ہوں۔

ابراہیم بن شیبانؒ کہتے ہیں کہ میں نے حج کیا پھر فراغت کے بعد مدینہ آیا، اور روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سلام کیا، تو میں نے حجرہ شریف کے اندر سے ''وعلیک السلام'' کی آواز سنی (القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع: ۱۶۵/۱، مکتبہ شاملہ)

حضرت رفاعی کا ایک واقعہ

سید احمد کبیر رفاعی رحمہ اللہ جو حضرت غوث پاک کے معاصر ہیں، انہوں نے ۵۵۵ھ میں جب حج کیا اور روضہ اقدس پر حاضر ہوئے تو عرض کیا: السلام علیک یا جدی (دادا جان السلام علیک) جواب مسموع ہوا وعلیک السلام یا ولدی (بیٹا! وعلیک السلام) اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے۔

في حالة البعد روحي كنت أرسلها تقبل الأرض عني وهي نائبتي وهذه نوبة الأشباح قد حضرت فامدد يمينك كي تحظى بها شفتي

جب ہم دور تھے تو اپنی روح کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا کرتے تھے وہ روضۃ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر زمین بوس ہو جایا کرتی تھی اب جسم کی باری آتی ہے، ذرا اپنا دست مبارک بڑھایئے؛ تاکہ میرا لب اس سے بہرہ ور ہو سکے اور ہونٹوں کو (بوسہ) کی دولت نصیب ہو جائے۔

علامہ جلال الدین السیوطیؒ نے نقل کیا ہے کہ روضہ اقدس کے اندر سے ایک نہایت نورانی ہاتھ ظاہر ہوا (جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا) وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک تھا، انہوں نے دوڑ کر بوسہ دیا اور بے ہوش ہو گئے، بس ہاتھ غائب ہو گیا، مگر

کیفیت یہ ہوئی کہ تمام مسجد نبوی میں نور ہی نور پھیل گیا، ایسا نور کہ اس کے سامنے آفتاب کی بھی حقیقت نہ تھی اور واقعی آفتاب کی، اس نور کے سامنے کیا حقیقت ہوتی، ایک بزرگ سے جو کہ اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو رشک تو بہت ہوا ہوگا، فرمایا ہم تو کیا، اس وقت ملائکہ کو بھی رشک تھا کہ ہمیں بھی یہ دولت نصیب ہوتی (دیکھئے خطبات حکیم الامت:۱۴/۲۰۲)

اگر چہ بعض ظاہر پرست اور تصوف سے دلچسپی نہ رکھنے والے علماء نے اس واقعہ کا انکار کیا ہے؛ لیکن محققین علماء نے اس واقعہ کی صحت پر شبہ نہیں کیا ہے، ہمارے اکابر میں حضرت تھانویؒ نے اشرف الجواب، میں اسی طرح مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے فتاویٰ رحیمیہ میں اس واقعہ کو علامہ جلال الدین السیوطیؒ کے رسالہ ''شرف ختم'' کے حوالے سے سند کے ساتھ نقل کیا، اور علامہ صفوری الشافعی (م:۸۹۴ھ) نے تو ان اشعار کو نقل کر کے لکھا ہے:

ولا إنكار في ذلك فإن إنكار ذلك يؤدي إلى سوء الخاتمة والعياذ بالله و إن كرامات الأولياء حق ، والنبي صلى الله عليه وسلم حي في قبره سميع بصير منعم في قبره (نزهة المجالس و منتخب النفائس: ۱/۱۹۰)

روضہ اقدس پر درود افضل ہے یا سلام؟

علامہ باجیؒ کی رائے یہ ہے کہ درود افضل ہے، علامہ سخاویؒ کہتے ہیں کہ روضہ اقدس کے پاس کھڑے ہو کر سلام پڑھنا افضل ہے؛ کیونکہ حدیث میں **مامن مسلم يسلم علي عند قبري** وارد ہوا ہے۔

ليعلم أن السلام عليه صلى الله عليه وسلم عند قبره أفضل من الصلوٰة و قال الباجي يدعو بلفظ الصلوٰة والظاهر الأول (القول البديع: ۱/۲۱۴)

شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ لکھتے ہیں:

لیکن اس ناکارہ کے نزدیک صلاۃ کا لفظ (یعنی درود) بھی کثرت سے روایات میں ذکر کیا گیا ہے؛ اس لئے بندہ کے خیال میں اگر ہر جگہ درود وسلام دونوں کو جمع کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے، یعنی بجائے السلام علیک یا رسول اللہ، السلام علیک یا نبی اللہ کے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ الصلوٰۃ والسلام علیک یا نبی اللہ کہے۔ اس صورت میں علامہ باجیؒ اور علامہ سخاویؒ دونوں کے قول پر عمل ہو جائے گا (فضائل درود شریف:۲۴)

جب تک مدینہ میں قیام ہو خوب سلام عرض کیجیے

مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جب تک مدینہ منورہ میں قیام ہو کثرت سے روضہ اقدس کے سامنے حاضر ہو کر سلام عرض کیا کرے، خصوصاً پانچ نمازوں کے بعد (زبدہ)

مسئلہ: اگر کسی وقت خاص مواجہ شریف پر حاضری کا موقع نہ ملے تو روضہ اقدس کے کسی طرف بھی کھڑے ہو کر یا مسجد نبوی میں کسی جگہ بھی سلام عرض کر سکتا ہے، اگر چہ اس کی وہ فضیلت نہیں جو سامنے حاضر ہو کر سلام عرض کرنے کی ہے۔

مسئلہ: عورتوں کو بھی روضہ اقدس کی زیارت اور مواجہ شریف میں حاضر ہو کر سلام عرض کرنا چاہیے، البتہ ان کے لئے بہتر ہے کہ رات کے وقت حاضر ہوں، اور جب زیادہ ازدہام ہو تو کچھ فاصلہ ہی سے سلام عرض کر دیں (جواہر الفقہ:۴/۱۷۶)

روضۂ اقدس پر حاضری کے آداب

جب روضہ اقدس پر حاضری کا ارادہ ہو تو خوب طہارت ونظافت کا اہتمام کرنا چاہیے، مناسب یہ ہے کہ غسل کر لے اور اچھا سا لباس زیب تن کر کے بالوں میں کنگھا کر لے، خوشبو اور سرمہ کا اہتمام ہو، اپنی قیام گاہ سے باہر نکل کر پہلے کچھ صدقہ کریں، وقار کے ساتھ ڈرے سہمے کہ کہیں کوئی بے ادبی یا گستاخی نہ ہو جائے، قدم اٹھاتے ہوئے مسجد نبوی تک آئیں، آسانی ہو تو باب جبرئیل سے مسجد میں

داخل ہونے کی کوشش کرے، اور داہنا قدم رکھتے ہوئے: **بسم الله والصلاة والسلام على رسول الله اللهم اغفرلي ذنوبي، وافتح لي أبواب رحمتك** پڑھ لے اور اعتکاف کی نیت کرلے، اگر سہولت ہو تو سیدھے ریاض الجنۃ پہنچ کر محراب میں یا اس کے محاذ میں یا جہاں آسانی سے ہوسکے، دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے، نماز سے فارغ ہوکر اپنے ہوش وحواس درست کرے، تاکہ سستی وغفلت نہ کرے، اس کا استحضار کرے یہ دربار کس کا ہے، محبوب رب العالمین کا، شفیع المذنبین کا، رحمۃ للعالمین کا، یہ سوچے کہ یہاں تو مقرب فرشتے حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل وغیرہ سلام کو آتے ہیں، اور روضہ اقدس کی جانب نہایت سکون ووقار کے ساتھ بڑھے اور مواجہ شریف پر پہنچنے کی کوشش کرے، جالی مبارک میں تین جھروکے ہیں، اندر کی طرف حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مبارک قبروں کا سامنا ہوتا ہے، ان جالیوں کی دیوار سے تین چار ہاتھ کے فاصلہ پر کھڑا ہونا چاہیے یا جہاں جگہ مل جائے، زیادہ قریب ہونا بے ادبی ہے، آنکھیں پرنم ہوں، دل دھڑک رہا ہو، نگاہیں نیچی ہوں، ادھر ادھر دیکھنا، اندر جھانکنا، سخت بے ادبی ہے، پاؤں ساکن اور باوقار رکھنا چاہیے۔

مکی مدنی ہاشمی مطلبی
آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی
آہستہ قدم، نیچی نگاہ، پست ہو آواز
خوابیدہ یہاں روح رسول عربی

اب یہ تصور کرے کہ چہرہ انور اس وقت میرے سامنے اور سرکار دو عالم کو میری حاضری کی خبر ہے، پھر ذوق وشوق سے صلاۃ وسلام کا نذرانہ پیش کرے، مخصوص سلام یاد ہو تو وہ پڑھے ورنہ الصلاۃ والسلام علیک یارسول اللہ، والصلوٰۃ والسلام علیک یا نبی اللہ پڑھے، اگر دوسرے لوگوں نے سلام پہنچانے کی درخواست کی ہو تو ان کا سلام پہنچا دینا چاہیے، پھر اللہ سے دعائیں مانگنی چاہئیں اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء مغفرت کی درخواست کرنی چاہیے، پھر تقریباً ایک ہاتھ دائیں طرف ہٹ کر، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سلام پڑھنا چاہیے پھر تقریباً ایک ہاتھ بائیں ہٹ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلام پڑھنا چاہیے، اس کے بعد پھر پہلی جگہ یعنی سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے آجائے، اور خوب دعائیں کرے، اور حضرات شیخین کے لئے بھی دعائیں مانگنی چاہیے، پھر عزیز واقارب، دوست واحباب اور جنہوں نے دعا کی درخواست کی ہے، ان کے لئے بھی دعائیں مانگے، پھر تمام مسلمانان عالم کی خیر وبھلائی کی دعا کرکے دعا ختم کرے، تفصیل کے لئے دیکھیے۔ (فتح القدیر: ۱۸۰/۳، کتاب الحج، شرح الشفاء لملا علی قاری: ۱۶۱/۲، فصل فیما یلزم من دخل المسجد، وفاء الوفاء: ۲۱۵/۴، الفصل الرابع فی آداب الزیارۃ، معلم الحجاج: ۱۹۳)

روضۂ رسول کا ادب و احترام، چند آیات

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الخصائص الکبری میں روضہ رسول کے مقام ومرتبہ اور ادب واحترام پر قرآن کریم کی چار آیات کے ذریعہ استدلال کیا ہے، ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سننے اور جاننے والے ہیں (الحجرات: ۱)

(۲) اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو، نبی کی آواز سے، اور ان کے حضور بات چلا کر نہ کہو، جیسے ایک دوسرے کے سامنے چلاتے ہو کہ کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہوجائیں اور تمہیں خبر نہ ہو (الحجرات: ۲)

(۳) بے شک وہ لوگ جو رسول اللہ کے پاس اپنی آوازیں پست کرتے ہیں، وہ لوگ ایسے ہیں جن کا دل اللہ نے پرہیزگاری کے لئے پرکھ لیا ہے، ان کے لئے بخشش اور بڑا ثواب ہے (الحجرات: ۳)

(۴) بے شک وہ لوگ جو آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں

ان میں اکثر بے عقل ہیں، اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ان کے پاس تشریف لاتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (الحجرات:۵)

ان آیات کو لکھنے کے بعد آگے لکھتے ہیں: **قال جماعة و يكره رفع الصوت عند قبره صلى الله عليه وسلم؛ لأن حرمته ميتا كحرمته حيا.**

روضۂ اقدس پر آواز بلند کرنا، چلانا مکروہ ہے، کیونکہ آپ کا ادب واحترام بعد وفات اسی طرح ہے جس طرح آپ کی زندگی میں تھا۔

آگے ایک واقعہ نقل کیا ہے: ابن حمید سے روایت ہے کہ ابوجعفر المنصور نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد نبوی میں مناظرہ کیا، اس وقت ابوجعفر خلیفہ کے ساتھ پانچ سو شمشیر بند موجود تھے، امام مالک نے ابوجعفر سے فرمایا: اے امیر المومنین اس مسجد میں اپنی آواز اونچی نہ کرو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ادب سکھلایا ہے، **لاترفعوا اصواتكم** (الحجرات) اور ان مسلمانوں کی تعریف کی گئی ہے جو آواز پست رکھتے ہیں: **ان الذين يغضون اصواتهم** (الحجرات) اور بے ادب لوگوں کی مذمت فرمائی ہے، ارشاد ہے: **ان الذين ينادونك من وراء الحجرات** (الحجرات)

و إن حرمة رسول الله صلى الله عليه وسلم ميتا كحرمة حيا فاستكان له الخليفة:

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کا احترام بعد وصال بھی ایسا ہے جیسا کہ حیات مبارکہ میں تھا، یہ سن کر خلیفہ ابوجعفر نے عاجزی اختیار کی (الخصائص الکبری:۲/۴۴۵، مطبوعہ دار الکتب بیروت)

روضہ رسول کی حفاظت کا ایک واقعہ

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس وہ ذات تھی جس کی حفاظت، بحالت زندگی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر فرشتوں کے ذریعہ کی جاتی تھی، چاہے وہ مکہ میں آپ کے قتل کا منصوبہ ہو یا یہودیوں کی بستی میں پتھر گرانے یا زہر کھلانے کا واقعہ ہو، ہر موقع پر من جانب اللہ آپ کی حفاظت کی گئی، دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد تاریخ میں ایک واقعہ ایسا بھی پیش آیا کہ دوخبیث الفطرت یہودیوں نے قبر اطہر سے نعش مبارک نکالنے کا غلیظ منصوبہ بنایا تھا؛ لیکن یہاں بھی نصرت الٰہی مانع بن گئی۔ اختصار کے ساتھ واقعہ ملاحظہ فرمائیں: ابن العماد حنبلی (م:۱۰۸۹ھ) نے اپنی کتاب شذرات الذہب میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے: واقعہ ۵۵۷ھ کا ہے، راقم الحروف نے مضمون کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔

مشہور مجاہد فی سبیل اللہ اور بزرگ امیر المومنین سلطان نور الدین محمود زنگی ایک رات امور مملکت کی انجام دہی اور عبادات و وظائف سے فراغت کے بعد جیسے ہی سوئے رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور حضور کے ساتھ دو اور چہرے نظر آنے لگے، جن پر نحوست کے آثار تھے، رسول اللہ ﷺ نے سلطان نور الدین کو متوجہ کرتے ہوئے کہا:

يا محمود انقذني من هذين الشخصين

مجھے ان دو شیطان صفت لوگوں سے نجات دلاؤ، سلطان نور الدین نے اپنے وزیر جمال الدین موصلی کو فوراً بلایا، امیر المومنین نے اپنا خواب بیان کیا، وزیر نے کہا: ایسا لگتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ ہونے والا ہے، ہمیں بلا تاخیر مدینہ جانا چاہیے، چنانچہ امیر المومنین نے فوراً کوچ کا اعلان کیا، اور تیس نامور قسم کے افراد پر مشتمل ایک قافلے کی ہمراہی میں انتہائی سبک رفتار سواریوں پر مدینہ منورہ کی جانب چل پڑے، اور تقریباً سولہ روز کی مسافت کے بعد آپ مدینہ پہنچ گئے، امیر المومنین نے مدینہ کے گورنر سے رسمی گفتگو کے بعد اپنی آمد کا

مقصد بتایا؛ چنانچہ باہمی مشاورت کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مدینہ کے ہر ہر فرد کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، بوڑھا ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، ہر کسی کو شاہی دعوت نامہ دیا جائے، کہ امیر المومنین دار الخلافہ دمشق سے روضہ رسول کی زیارت کے لئے تشریف لائے ہیں، زیارت کے بعد امیر المومنین کی طرف سے تمام اہل مدینہ کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہے، اس کے بعد امیر المومنین اپنے ہاتھوں ہدایا بھی تقسیم کریں گے، ہر فرد کا حاضر ہونا ناگزیر ہے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، ہر شخص کو ہدیہ دیتے وقت امیر المومنین اس کے چہرے کو بغور دیکھتے تھے، تمام لوگ فارغ ہو گئے؛ لیکن وہ دونوں چہرے نظر نہ آئے، امیر المومنین حد درجہ پریشان ہوئے، اور گورنر سے پوچھا: کیا کوئی باقی تو نہیں ہے، گورنر نے بتایا کہ سوائے دو شخصوں کے باقی سب نے شرکت کی ہے، دو بزرگ ہیں جو اندلس سے آئے ہوئے ہیں، وہ عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ گوشہ نشین بھی ہیں، مالدار بھی ہیں؛ اس لئے عموماً کسی سے ملتے جلتے نہیں ہیں؛ اس لئے ہم نے انہیں مدعو بھی نہیں کیا کہ انہیں خلل ہوگا۔

امیر المومنین کو سخت غصہ آیا اور فوراً انہیں بلانے کا حکم دیا، وہ دونوں آئے، سلطان نور الدین کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ خواب میں جن دو چہروں کو دیکھا تھا وہ منحوس چہرے انہیں دو آدمیوں کے تھے، امیر المومنین نے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟ انہوں نے کہا ہم حج کے لئے آئے تھے، پھر مدینہ آئے تو اب یہاں سے جانے کو جی نہیں کرتا، امیر المومنین نے کہا: سچ سچ بتاؤ ورنہ تمہیں عبرتناک سزا دی جائے گی، ان دونوں نے گھبراہٹ کے عالم میں حقیقت حال بتائی کہ ہم دونوں یہودی ہیں، اور ہمیں ایک مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے کہ کسی طرح ہم تمہارے رسول کا جسم اطہر ان کے روضہ سے نکال کر اسلام مخالف طاقتوں تک پہنچا دیں، جب روضہ میں رسول ہی نہیں ہوں گے تو مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے، انہیں شکست دینا آسان ہوگا، چنانچہ ہم جسم اطہر کو چوری کرنے کے لئے آئے ہیں۔

امیر المومنین ان مکاروں کو لے کر ان کے کمرے میں پہنچے، اور ہر چیز کا باریکی سے جائزہ لیا؛ لیکن کچھ نظر نہیں آیا، کمرے سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کے نیچے پڑی ہوئی چٹائی کو ہٹایا، تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نیچے ایک بڑا سوراخ نظر آیا، جس میں ایک شخص آرام سے اتر سکتا تھا، سلطان نور الدین نیچے اتر گئے، نیچے ایک بہت بڑی سرنگ تھی، آپ اندر چلتے گئے، اور جب سرنگ کے کنارے پہنچے تو انگشت بدنداں دیکھتے رہ گئے، کہ اس کا آخری سرا روضہ اقدس کی دیوار تک پہنچ چکا ہے؛ بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنین کو آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک بھی دکھائی دیئے، اس کے بعد ان دونوں نام نہاد بزرگوں کو عبرتناک سزا دلوائی، انہیں قتل کرا دیا، اور اس کے بعد روضہ اقدس کے چاروں طرف سیسہ پلائی ہوئی فولادی اور آہنی دیواریں تعمیر کروائیں تا کہ آئندہ کوئی ایسا ناپاک اقدام نہ کر سکے۔(شذرات الذهب في أخبار من ذهب: ٦/ ٣٨٠، المكتبة الشاملة)

بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں روضۂ رسول کی سعادت سے بار بار سرفراز فرمائے؛ کیونکہ یہ زیارت ایسی لازوال نعمت ہے جس کی کثرت، انسان کے لیے سب سے بڑے شرف وسعادت کی باعث ہے۔

یا رب صل وسلم دائما ابدا

علی حبیبك خیر الخلق کلهم

☆☆☆

بحث و تحقیق

رسول رحمت ﷺ کے گھوڑے

عبدالستار خان

جاہلیت میں عربوں کو گھوڑوں سے بہت زیادہ شغف تھا۔ وہ گھوڑوں کو اپنی اولاد پر فضیلت دیتے تھے۔ جس شخص کے پاس گھوڑا نہ ہوتا تو اسے قوم طعنے دیا کرتی تھی۔ عربوں کے معروف شاعر عنترہ نے ایک عرب قبیلے کو اپنے اشعار میں طعنہ دیا کہ تم کیسی قوم ہو جو گھوڑوں کو اہمیت نہیں دیتی۔

عربوں کے شرفاء اور قبیلوں کے سردار گھوڑوں کی خدمت خود کیا کرتے تھے۔ وہ یہ کام خدام اور غلاموں سے نہیں لیتے تھے۔ عربوں کے حکماء کہا کرتے تھے کہ: قبیلوں کے سردار اور شرفاء کیلئے تین کام کرنے میں عار نہیں: والد، مہمان اور گھوڑے کی خدمت۔ گھڑ سواری اور دوڑ کے مقابلوں میں شرکت قابل فخر ہوا کرتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ اپنے کارناموں کو اشعار میں ڈھالتے اور عکاظ جیسے بڑے میلوں میں ان اشعار کو دہرایا کرتے اور فخر کیا کرتے تھے۔ اسلام نے بھی گھوڑوں کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے پالنے کی ترغیب دی۔ گھوڑوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھائی ہے: ''قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں۔'' (العادیات 1،2)۔

عربوں کی گھوڑوں سے محبت کی وجہ سے ہی قرآن مجید میں جب دنیا کی مثال اس طرح دی گئی: ''لوگوں کیلئے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوشنما بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں، حقیقت میں جو بہتر ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔'' (آل عمران 14)۔

رسول اکرم ﷺ نے بھی گھوڑوں کی تکریم میں فرمایا: ''جس نے جہاد فی سبیل اللہ کیلئے گھوڑا پالا اسے روزہ دار کے مثل اجر ملے گا اور جس نے گھوڑے کو کھلانے، پلانے اور پالنے پر خرچ کیا تو اس کا خرچ صدقہ شمار کیا جائیگا۔'' ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ''بھلائی گھوڑوں کی پیشانی پر تا قیامت ثبت رہے گی۔'' آپؐ نے گھوڑوں کی تذلیل وتحقیر کرنے سے سختی سے منع فرمایا۔ آپؐ نے گھوڑوں کی دم کاٹنے سے، خصی کرنے سے اور پیشانی کے بال کاٹنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے کی فطرت میں اِترانا شامل ہے۔ ایسا کرنے سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں معروف ہے کہ آپ اسلام سے قبل عکاظ میلے میں گھوڑوں کی دوڑ میں شامل ہوتے تھے۔ آپ قریش کے بہترین گھڑ سواروں میں تھے۔ آپؓ کے

قد وقامت کے بارے میں لکھا ہے کہ آپؐ گھوڑے پر اچھل کر اور جم کر بیٹھتے، سواری پر بیٹھتے تو پاؤں زمین سے ٹکراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں نے جس طرح اپنی نسل اور نسب کا خیال رکھا، اسی قدر گھوڑوں کی نسب ونسل کا بھی خیال رکھا۔ عربوں میں معروف ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام پہلے شخص تھے جو گھوڑے پر سوار ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ہمیں ملتا ہے کہ آپؑ کو گھوڑوں سے خاص شغف تھا۔ آپؑ کے پاس ایک ہزار گھوڑے تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو ورثے میں ملے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: ''مجھے میرے والد سے ورثے میں عزیز ترین مال یہی گھوڑے ملے ہیں۔'' دیگر متعدد روایتوں میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ان کے گھوڑے پیش کئے گئے تو ان میں اتنے محو ہو گئے کہ اللہ کی یاد سے غافل ہو گئے۔ قرآن مجید میں اس بات کی طرف اشارہ ہے: ''قابل ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے تیز رو گھوڑے پیش کئے گئے تو اس نے کہا کہ میں نے اس مال کی محبت اپنے رب کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے، یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انہیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے۔'' (ص 33-31)۔

گھوڑوں کا شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ دنیا میں مختلف نسل کے گھوڑوں کی اپنی اہمیت ہے مگر عربی النسل گھوڑا دنیا بھر میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ یہ خالص النسل گھوڑا ابھی ماہرین کے نزدیک کئی درجے رکھتا ہے۔ گھوڑے نہ صرف سواری کیلئے کام آتے ہیں بلکہ عربوں کی گھوڑوں سے محبت معروف تھی۔ وہ اپنے گھوڑوں سے اس قدر محبت کرتے تھے جیسے کوئی آدمی اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ اسی شغف کی وجہ سے عربوں کے ہاں گھوڑوں کے کئی کئی نام ہیں۔ عربوں کے معروف علماء، مفکرین اور دانشوروں نے گھوڑوں کی اقسام پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کتابوں میں ابن کلبی کی کتاب ''انساب الخیل''، یعنی گھوڑوں کی نسلیں۔ غندجانی کی ''گھوڑوں کے نام اور نسلیں''، اصمعی کی ''گھوڑوں کے متعلق ''شافی جواب''، ابن ہذیل اندلسی کی ''حلیۃ الفرسان'' معروف ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ صاحبی، نمیری اندلسی، دمیاطی او رحال ہی میں سعودی عرب کے تاریخ دان حمد الجاسر نے بھی گھوڑوں کی انواع واقسام، نسلیں اور دیگر مختلف امور پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ غسانی کی کتاب گھوڑوں کے متعلق مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔

علامہ جاحظؒ نے لکھا ہے: ''عربوں کی طرح دنیا کی کوئی قوم نہیں جو گھوڑوں سے اتنا شغف رکھتی ہو، نہ ہی کوئی قوم دنیا میں ایسی ہے جسے عربوں سے زیادہ گھوڑوں کا علم ہو۔ گھوڑے کا عرب کی زندگی سے نہ صرف گہرا تعلق ہے بلکہ یہ ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کی زبان، شعر وادب میں گھوڑوں کا بہت زیادہ ذکر ہے۔ گھوڑوں نے عرب شعراء کے خیال کی سیرابی کی تو انہوں نے گھوڑوں کی مختلف خصال وعادات کو شعر میں سمو دیا''۔

گھوڑے نہ صرف سواری اور کھیل کے میدان میں استعمال ہوتے بلکہ اہم ترین جنگی سامان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے دانشور اکثم بن صیفی نے اپنی قوم کو وصیت کی: ''اے میری قوم! گھوڑے پالو اور ان کی تکریم کرنا سیکھو، یہ عرب کے قلعے ہیں۔''

عربوں کا گھوڑوں سے شغف کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک صحابی

حاضر ہوئے اور بڑی بے چینی سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا جنت میں گھوڑے بھی ہوں گے؟۔ آپ مسکرائے اور فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جنت میں داخل کیا اور تم نے وہاں سرخ یاقوت سے بنے ایک گھوڑے کی تمنا کی جس کے دو بڑے بڑے پر ہوں اور وہ تمہیں جنت میں جہاں چاہو لے کر اڑے تو اللہ تعالیٰ تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کردے گا۔''

غالباً اسی مقام پر اونٹ کا شغف رکھنے والے ایک صحابی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا جنت میں اونٹ بھی ہوں گے؟۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر اللہ تمہیں جنت میں داخل کردے تو وہاں جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔''

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اماں عائشہ کے پاس مختلف شکلوں کے بنے کھلونے رکھے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: ''عائشہ یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! یہ میری بیٹیاں ہیں۔'' ان کھلونوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے دو پر تھے، اس کی طرف اشارہ کرکے آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کیا ہے؟'' سیدہ عائشہؓ نے عرض کیا: یہ گھوڑا ہے۔ آپؐ نے پروں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: یہ اس کے پر ہیں۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: گھوڑے کے پر ہیں؟، اماں عائشہؓ نے فرمایا: ہاں! کیا آپؐ نے سنا نہیں کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے گھوڑے کے دو پر تھے۔ یہ سن کر آپؐ ہنسے یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھ مبارک نظر آئی۔

عربوں میں معروف ہے کہ گھوڑے 3 قسم کے ہیں: ایک گھوڑا رحمٰن کیلئے ہے، ایک گھوڑا شیطان کیلئے ہے اور ایک گھوڑا انسان کیلئے۔ رحمٰن کا گھوڑا وہ ہے جو آدمی جہاد کی نیت سے پالے اور اس کی رکھوالی کرے۔ اس گھوڑے کا پالنا، اسے چارہ دینا، اس کی نگرانی کرنا اور یہاں تک کہ اس کے گوبر اور پیشاب کو صاف کرنا بھی پالنے والے کی نیکیوں میں لکھا جائے گا۔ شیطان کا گھوڑا وہ ہے جو جوا کھیلنے اور ریس میں دوڑا کر شرطیں لگانے کیلئے ہوتا ہے جبکہ انسان کا گھوڑا وہ ہے جو وہ اسے اپنی سواری کیلئے پالتا ہے۔

گھوڑوں کی تکریم کا حکم متعدد احادیث میں ملتا ہے، آپؐ نے فرمایا: گھوڑے کو پیشانی سے پکڑ کر مت کھینچو کہ یہ اس کی تذلیل ہے۔ گھوڑوں کی تکریم کرو اور اسے باعزت رکھو۔

گھوڑا اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔ اگر گھوڑے سے خلاف ادب یا خلاف معمول یا خلاف توقع کام ہو تو اس کی سرزنش کی جائے اور اسے ٹوکا جائے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''گھوڑے کی ملامت کرو اور اسے ٹوکو کیونکہ وہ ملامت سمجھتا ہے اور ڈانٹنے سے سنبھل جاتا ہے اور ان کی تربیت کرو۔''

ایک حدیث میں ہے: ''گھوڑے پر خرچ کرنے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہو۔''

گھوڑے پالنے کی ترغیب قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں متعدد مرتبہ آئی ہے، ارشاد ربانی ہے: ''اس نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ باعث زینت بھی ہیں۔'' (النحل 8)۔

سورہ الانفال، آیت 60 میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مرد مومن وہ ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور میدان جنگ میں گھوڑا موثر ہتھیار ہے: ''اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کیلئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور اُن دوسرے اعداء کو خوف زدہ کردو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔''

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج ہر وقت تیار رہنی چاہئے تا کہ وقتِ ضرورت فوراً جنگی کارروائی کرسکو، یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضا کار اور اسلحہ اور سامانِ رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو، دشمن اپنا کام کر جائے۔''

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب ''زاد المعاد'' میں رسول رحمت ﷺ کے گھوڑوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''رسول اکرمؐ کے پاس متعدد گھوڑے تھے جن کی تعداد کے تعین میں اختلاف ہے تاہم غالب گمان یہ ہے کہ ان کی تعداد 7 تھی۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے گھوڑے بڑے مبارک تھے کیونکہ سواری کی قدر و قیمت سوار سے ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ اولادِ آدم کے سردار ہیں اور آپؐ کے گھوڑوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ ان پر سوار ہوئے۔''

آپ کی ملکیت میں آنے والے اولین گھوڑے کا نام ''السکب'' تھا، آپؐ نے بنی فرازہ سے تعلق رکھنے والے ایک آدمی سے 10 اوقیہ چاندی کے بدلے خریدا تھا، اسکا نام ''الضرس'' تھا، آپؐ نے نام بدل کر ''السکب'' رکھ دیا۔

المرتجز کے ہنہنانے کی آواز منفرد تھی، جس طرح میدان جنگ میں شاعر رجز پڑھ کر سپاہیوں کے حوصلے بلند کرتا ہے، اسی طرح المرتجز گھوڑے کے ہنہنانے سے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔

''الحیف'' گھوڑے کی دم بہت گھنی اور طویل تھی، یہ لفظ ''لحاف'' سے نکلا ہے، جب یہ گھوڑا چلتا تو اس کی دم اس قدر لمبی اور گھنی ہوتی گویا زمین میں لحاف بچھا ہوا ہے۔

''لزاز'' گھوڑا اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس نے تحفہ کیا تھا، لزاز کا ایک مطلب چپک جانا بھی ہے، مطلب یہ کہ دوڑ میں حریف گھوڑے سے چپک جانے والا۔

سبحہ بھورے رنگ کا گھوڑا تھا، اسے رسول اکرم ﷺ نے 10 اونٹنیوں کے بدلے خریدا تھا، غزوہ موتہ کے موقع پر آپ نے یہ گھوڑا حضرت جعفر طیارؓ کو دیا۔

ذیل میں آپؐ کے گھوڑوں کا تعارف پیش ہے:

السکب: آپؐ کی ملکیت میں آنے والے اولین گھوڑے کا نام ''السکب'' تھا۔ علامہ ابن سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے ''آپؐ نے یہ گھوڑا بنی فرازہ سے تعلق رکھنے والے ایک آدمی سے 10 اوقیہ چاندی کے بدلے خریدا تھا۔ اس آدمی نے اس مبارک گھوڑے کا نام ''الضرس'' رکھا ہوا تھا۔''

جیسا کہ آپؐ کی مبارک عادت تھی کہ برے ناموں کو اچھے ناموں سے تبدیل فرماتے تھے اسی طرح آپؐ نے ''الضرس'' گھوڑے کا نام بدل کر ''السکب'' رکھ دیا۔ یہی پہلا مبارک گھوڑا ہے جو آپؐ کی ملکیت میں آیا اور اسی پر آپؐ نے غزوہ احد میں شرکت کی تھی۔ اس گھوڑے کا نام ''السکب'' اس لئے رکھا گیا کہ یہ ایسے دوڑتا تھا جیسے سمندر کی روانی۔ ''سکب'' بہنے کو کہتے ہیں اور یہ تشبیہ ہے کہ جس طرح پانی بہتا ہے ویسے ہی یہ گھوڑا دوڑتا تھا۔

المرتجز: دوسرے گھوڑے کا نام ''المرتجز'' تھا۔ اس گھوڑے کا نام المرتجز اس لئے رکھا گیا کہ اس کے ہنہنانے کی آواز منفرد تھی۔ شاعری کی ایک قسم ہے جسے ''رجز'' کہا جاتا ہے۔ یہ شاعری میدان جنگ میں سپاہیوں کے حوصلے بلند کرنے کیلئے پڑھی جاتی ہے۔ جس طرح میدان جنگ میں شاعر رجز پڑھ کر سپاہیوں کے حوصلے بلند کرتا ہے، اسی طرح المرتجز گھوڑے کے ہنہنانے سے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہوتے ہیں گویا گھوڑا بھی رجز پڑھ رہا ہو۔

المرتجز گھوڑے سے وابستہ ایک دلچسپ واقعہ ہے جو امام طبرانیؒ سے منقول ہے۔ وہ اس طرح کہ آپؐ نے یہ گھوڑا سواد بن حارث نامی ایک بدو سے خریدا تھا۔ جب قیمت کا تعین ہوگیا اور سودا پکا ہوگیا تو آپ نے بدو سے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو، میں گھر میں تمہیں رقم دیتا ہوں۔ اب رسول اکرم ﷺ آگے آگے چل رہے ہیں اور بدو گھوڑے کی لگام تھامے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ راستے میں کچھ لوگوں نے بدو سے پوچھا کہ یہ گھوڑا ہم خریدیں گے اور انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے زیادہ رقم کی پیشکش کردی۔ اب بدو لالچ میں آگیا۔ اس نے رسول اکرم ﷺ کو آواز دی۔ آپ (ﷺ) یہ گھوڑا خریدیں گے یا میں کسی اور کو فروخت کردوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تو تم سے خرید لیا ہے (یعنی سودا پکا ہو چکا ہے)۔'' بدو مکر گیا اور کہا: نہیں! میں نے تو نہیں بیچا۔ آپؐ نے فرمایا: ''بلکہ میں نے تم سے خریدا ہے۔'' بدو نے کہا: کوئی گواہ ہے جو آپؐ کی بات کی تصدیق کرے۔ ابھی یہ بات چیت چل رہی تھی کہ معروف صحابی حضرت خزیمہ ثابت انصاریؓ وہاں پہنچ گئے۔ پوچھا کیا ماجرا ہے، انہیں بتایا کہ رسول اکرم ﷺ نے گھوڑا خرید لیا اور بدو فروخت کرنے سے مکر گیا ہے۔ اس خرید وفروخت کا کوئی گواہ درکار ہے۔ حضرت خزیمہؓ نے عرض کیا ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ نے گھوڑا خریدا ہے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''کس بات کی گواہی دیتے ہو حالانکہ تم موقع پر موجود ہی نہیں تھے۔'' اور حقیقت میں اس خرید وفروخت کا کوئی گواہ تھا ہی نہیں۔ اس پر حضرت خزیمہؓ نے عرض کیا: ''مجھے آپؐ کی ہر بات پر یقین ہے، ہم ایمان لاتے ہیں کہ آسمان سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے، ہم آپؐ کی ہر بات کی تصدیق کرتے ہیں، اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک گھوڑے کی خرید وفروخت میں آپؐ خلاف واقعہ بات کہہ سکتے ہیں۔'' یہ سن کر رسول اکرم ﷺ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ''جس کیلئے (حضرت) خزیمہؓ گواہی دے تو اس کی گواہی کافی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ شرعی طور پر کسی معاملے میں 2 گواہوں کی موجودگی ضروری ہے مگر حضرت خزیمہؓ کو رسول اکرم ﷺ کی بات سے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ان کی گواہی 2 گواہوں کی گواہی کے برابر ہوگئی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت خزیمہؓ کو جو اعزاز عطا فرمایا وہ بعد میں تاریخ کے ایک اہم واقعے میں نہایت موثر ثابت ہوا۔

ہوا یوں کہ رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن مجید کو جمع کرنے کا کام شروع کیا تو لوگوں کو حکم دیا گیا کہ جس کے پاس کوئی آیت یا قرآن کا حصہ لکھا ہوا ہو وہ لے آئے اور اس پر 2 گواہوں کی موجودگی ضروری ہے کہ وہ گواہی دیں کہ یہ آیت قرآن مجید ہی کی ہے۔ جب پورے قرآن مجید کی تدوین کا کام مکمل ہوگیا تو آخری 2 آیتیں رہ گئیں جو سورۃ التوبہ کی آیات 128 اور 129 تھیں۔ لکھی ہوئی تو ملیں مگر ان پر 2 گواہ نہیں ملے۔ صرف ایک گواہی تھی جو حضرت خزیمہؓ کی ہی تھی۔ اس وقت حضرت زید بن ثابتؓ قرآن مجید کی تدوین پر مامور تھے۔ انہوں نے یہ 2 آیتیں قرآن مجید میں صرف ایک گواہ پر شامل کرلیں کیونکہ رسول اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق حضرت خزیمہؓ کی گواہی 2 گواہوں کے برابر ہے۔

اللحیف: ''اللحیف'' گھوڑے کی دم بہت گھنی اور طویل تھی۔ یہ لفظ ''لحاف'' سے نکلا ہے۔ جب یہ گھوڑا چلتا تو اس کی دم اس قدر لمبی اور گھنی ہوتی گویا زمین میں لحاف بچھا ہوا ہے، اس لئے اس گھوڑے کا نام ''اللحیف'' رکھا گیا۔ بخاری میں ہے کہ حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ نے فرمایا کہ ہمارے باغ میں رسول اکرم ﷺ کا گھوڑا تھا جسے ''اللحیف'' کہا جاتا

ہے۔ یہ گھوڑا آپ کو ربیعہ بن براء نے ہدیہ کیا جبکہ ایک اور روایت کے مطابق یہ گھوڑا ہدیہ کرنے والے فروہ بن عمرو جذامی تھے۔ آپ یہ گھوڑا اپنی عام سواری اور آمد ورفت میں استعمال کرتے تھے۔

اللزاز: ''لزاز'' گھوڑا رسول اکرم ﷺ کو اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس نے تحفہ کیا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے شاہِ مصر مقوقس کو مکتوب روانہ کر کے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو مقوقس نے آپ کو مختلف تحائف روانہ کئے جن میں اس گھوڑے کے علاوہ ایک کنیز حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی تھیں جن کے بطن سے حضرت ابراہیم ہوئے۔ اس گھوڑے کا نام لزاز اس لئے رکھا گیا کہ یہ بہت طاقتور اور تیز رفتار گھوڑا تھا۔ جب بھی دوڑ میں شامل کیا جاتا تو سب پر سبقت لے جاتا تھا۔ لزاز کا ایک مطلب چپک جانا بھی ہے، مطلب یہ کہ دوڑ میں حریف گھوڑے سے چپک جانے والا۔

الظرب: مضبوطی اور طاقت کی وجہ سے اس کا نام'' ظرب'' رکھا گیا۔ ظرب چھوٹے پہاڑ کو بھی کہا جاتا ہے۔ گھوڑے کی قوت اور شدت کو چھوٹے پہاڑ سے تشبیہ دی گئی۔ یہ گھوڑا بھی فروہ بن عمرو جذامی نے آپ کو ہدیہ کیا تھا۔

سبحہ: اس کا نام ''سبحہ'' اس لئے رکھا گیا کہ تیز رفتار تھا۔ ''سبح'' تیرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی تیز رفتاری کی مثال اس طرح دی جاتی گویا کہ گھوڑا تیر رہا ہو۔ سبحہ بھورے رنگ کا گھوڑا تھا۔ اسے رسول اکرم ﷺ نے جہینہ قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک بدو سے 10 اونٹنیوں کے بدلے خریدا تھا۔ آپ ایک مرتبہ جمعرات کے دن اس گھوڑے کو ریس میں لے گئے۔ آپ خود اس کی لگام کسی۔ اس دن سبحہ گھوڑا تمام گھوڑوں پر سبقت لے گیا۔ ریس میں جب گھوڑا دوڑتا تو زمین سے اس قدر غبار اٹھتا تھا کہ ماحول دھندلا جاتا۔ غزوہ موتہ کے موقع پر آپؐ نے یہ گھوڑا حضرت جعفر طیار کو دیا۔ آپؐ اسی گھوڑے کی پشت پر شہید ہوئے۔

الورد: ''ورد'' زردی مائل سرخ رنگ کا گھوڑا تھا جسے حضرت تمیم الداریؓ نے آپؐ کو تحفہ کیا تھا۔ بعد ازاں آپؐ نے ورد گھوڑا، حضرت عمر بن خطاب کو ہدیہ کر دیا۔ حضرت عمر نے اس گھوڑے کو اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے وقف کر دیا تھا۔

درج بالا 7 گھوڑوں میں اتفاق ہے جبکہ آپ کے پاس دیگر گھوڑے بھی تھے جن کی تعداد میں اختلاف ہے۔ وہ درج ذیل ہیں۔

ذو العقال: ''عقال'' ایک بیماری ہے جو جانوروں کو لگتی ہے، اس گھوڑے کا نام ذوالعقال اس لئے رکھا گیا تا کہ اسے یہ بیماری نہ لگے۔

الشحاء: اس گھوڑے کا نام ''شحاء'' اس لئے رکھا گیا کیونکہ یہ دوڑتا نہیں بلکہ قلانچیں بھرتا تھا۔

ذو اللمہ: سر کے بال جب کانوں سے نیچے تک طویل ہو جائیں اور کاندھوں تک پہنچیں تو انہیں ''لمہ'' کہا جاتا ہے۔

المرتجل: گھوڑے کی تیز رفتاری کی تشبیہ یہ دی گئی گویا ٹاپوں سے آگ کے شرارے نکل رہے ہوں۔

الادھم: گھوڑوں کے سردار کو ''ادہم'' کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یعسوب، بحر، الور اور دیگر گھوڑوں کے نام بھی ملتے ہیں جن میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔

☆☆☆

خصائص و امتیازات (قسط—۲)

امت محمدیہ، خصوصیات وامتیازات

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducationalsociety@gmail.com

گنہگاروں کی رسوائی و ذلت

اگر بنی اسرائیل میں کوئی شخص رات کی تاریکی میں گناہ کرتا تو صبح میں اس کے دروازے پر یہ لکھا ہوا ملتا کہ فلاں شخص نے فلاں گناہ کیا ہے، اور اس کا کفارہ (جرمانہ) یہ ہے اور اس لکھے ہوئے کو یعنی اس تحریر کو ہر کوئی دیکھتا اور پڑھتا۔

لیکن امت محمدیہ کے گنہگاروں کے ساتھ اللہ رب العزت نے خصوصیت کے ساتھ ستاری اور پردہ پوشی کا معاملہ فرمایا، اور اس امت کو بنی اسرائیل کی اس ذلت ورسوائی سے محفوظ فرمایا اور ان کے گناہوں پر پردہ ڈال دیا، ہاں اگر کوئی گنہگار خود خدائے وحدہ لاشریک کے اس پردے کو چاک کردے اور لوگوں میں اس کا چرچہ کرنے لگے، تو یہ اس کی کوتاہی، کم عقلی، بیوقوفی، نادانی اور بھول ہے اور خود اپنے آپ کو ذلت ورسوائی میں ڈالنے کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ نے تو اس امت پر ستاری کا ایسا معاملہ فرمایا ہے کہ مومن بندہ کو ہمہ وقت ذکر الٰہی سے زبان ودل کو لبریز رکھنا چاہئے اور اس انعام خداوندی پر سجدہ ریز ہونا چاہئے۔

بھول چوک پر مواخذہ اور گرفت

امم سابقہ یعنی پچھلی امتوں میں اگر کوئی شخص شریعت کے خلاف بھول چوک سے کوئی کام کرلیتا تو اس پر سزا ہوتی تھی۔ لیکن اللہ رب العزت اس امت سے بھول چوک اور خطاونسیان سے کئے گئے کاموں پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے اور مومن بندہ کی گرفت نہیں کریں گے۔ بلکہ بھول چوک اور جو کام کسی سے زبردستی کرایا گیا ہو اسے معاف کردیا جائے گا، مشکوۃ شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کردہ حدیث موجود ہے۔

عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال إن الله تجاوز عن امتی الخطا والنسیان وما استکرهوا علیه (مشکوٰۃ/ رواہ ابن ماجہ والبیہقی) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری سے خطاونسیان کو معاف کردیا ہے، اور اس گناہ سے بھی معافی عطا فرمادی ہے جس میں زبردستی مبتلا ہوگیا ہو۔

برے خیالات اور وسوسے پر مواخذہ اور گرفت:

امت محمدیہ سے پہلے سابقہ امتوں میں جو انبیاء کرام تشریف لائے تو انہوں نے اپنی امتوں کو یہ باور کرایا اور یہ الٹی میٹم دیا کہ جو بھی برے اعمال تم کروگے اس پر اللہ کی پکڑ ہوگی، یہاں تک جو برے خیالات اور وسوسے تمہارے دلوں میں آتے ہیں اس کا بھی محاسبہ ہوگا۔ لیکن اس

شریعت مطہرہ میں برے خیالات اور وسوسوں پر مواخذہ نہیں ہوگا جب تک کہ اس پر عمل نہ کرلیا جائے۔ لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا (سورہ بقرہ ۲۸۶) کی تشریح میں مفسرین نے اس کی وضاحت کی، خود آنحضرت ﷺ کے فرمان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وسوسے ایمان کے منافی نہیں اور ان پر مواخذہ بھی نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " ان اللہ تجاوز عن امتی ما وسوست بہ صدرھا مالو تعمل بہ او تتکلم" (رواہ البخاری ومسلم) اللہ تعالی نے میری امت سے دل کے برے خیالات اور وسوسوں کو معاف کر دیا ہے، ان پر عمل نہ ہو اور زبان سے نہ کہا جائے۔ مولانا منظور نعمانیؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''انسان کے دل میں بعض اوقات بڑے گندے خیالات اور خطرات آتے ہیں، اور کبھی کبھی منکرانہ اور ملحدانہ سوالات واعتراضات بھی دل ودماغ کو پریشان کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہے، ہاں جب یہی خیالات، خطرات ووساوس کی حد سے بڑھ کر اس شخص کا قول یا عمل بن جائیں، تو پھر ان پر مواخذہ اور محاسبہ ہوگا، اس حدیث میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ یہ خیالات اور وساوس جب تک کہ صرف خیالات اور وساوس ہیں ان پر کوئی مواخذہ نہیں''۔ (معارف الحدیث جلد اول ۱۰۶)

ایک اور حدیث میں ہے جس کے راوی بھی حضرت ابو ہریرہؓ ہی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ دریافت کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے دلوں میں ایسے برے خیالات اور وسوسے پاتے ہیں کہ ان کو زبان سے کہنا بھی بہت برا اور بہت بھاری معلوم ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا واقعی تمہاری یہی حالت ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں! یہی حال ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تو خالص ایمان ہے۔

اس سلسلے میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ محض وسوسہ ایمان کے منافی نہیں ہے اور اس پر اس امت کا محاسبہ بھی نہیں ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام اور احسان ہے اس امت پر، اگر اس کا ہر فرد پوری زندگی خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جائے جب بھی وہ اس احسان اور انعام کا کما حقہ شکر یہ ادا نہیں کر سکتا۔

طاعون پہلی امتوں کے لئے ایک عذاب تھا

: قوم بنی اسرائیل میں طاعون اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور عذاب اور سزا کے نازل ہوتا تھا۔ لیکن یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس نے اس امت کے لئے طاعون کو شہادت اور رحمت کا ذریعہ بنا دیا۔ عذاب وعقاب اور سزا کا ذریعہ نہیں بنایا۔

بخاری شریف کی حدیث ہے آپؐ نے فرمایا: (سألت رسول اللہ ﷺ عن الطاعون فأخبرنی أنہ عذاب یبعثہ اللہ تعالیٰ علی من یشاء، وأن اللہ جعلہ رحمۃ للمؤمنین) (بخاری ۳۴۷۴)

ہفتہ کے دن شکار کی حرمت

ہفتہ (سنیچر) کا دن جو بنی اسرائیل کے لئے عید کا دن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دن شکار کرنے سے روک دیا اور شکار کرنا حرام کر دیا تھا۔ جب بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی تو اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ان لوگوں کو بندر

بنادیا۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (سورہ بقرہ:۶۵) ''اورتم جانتے ہی ہوان لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے حد شرع سے تجاوز کیا تھا اس حکم کے بارے میں جو ہفتہ کے دن کے متعلق تھا کہ اس روز مچھلی کا شکار نہ کریں ، سو ہم نے ان کو کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ۔مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

اس آیت میں یہودیوں کے جس اعتداء یعنی حد سے تجاوز کا ذکر کر کے اس کو سبب عذاب بتایا گیا ہے، روایات سے ثابت ہے کہ وہ صاف طور پر حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ تھی ، بلکہ ایسے حیلے تھے جن سے حکم شرعی کا ابطال لازم آتا تھا، مثلاً ہفتہ کے دن مچھلی کی دم میں ایک ڈور کا پھندا لگا کر دریا میں چھوڑ دیا، اور یہ ڈور زمین پر کسی چیز سے باندھ دی، پھر اتوار کے روز پکڑ کر کھالیا، تو یہ ایسا حیلہ ہے جس میں حکم شرعی کا ابطال بلکہ ایک قسم کا استہزاء ہے ، اس لئے ایسا ،،کرنے والوں کو بڑا سرکش نافرمان قرار دے کران پر عذاب آیا۔

مگر اس سے ان فقہی حیلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ ﷺ نے بتلائے ہیں ۔مثلاً ایک عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا سود میں داخل ہے، مگر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ ﷺ نے یہ بتلایا ہے کہ جنس کا تبادلہ جنس سے نہ کرو، قیمت کے ذریعہ خرید وفروخت کرلو، مثلاً دو سیر خراب کھجور خرید لی، تو یہاں حکم شرعی کی تعمیل مقصود ہے ابطال نہ مقصود ہے نہ واقع ہے، اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کی بعض ایسی تدبیری بتلائیں ہیں، ان کو یہودیوں کے حیلہ کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے (معارف القرآن جلد اول)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہود نے اول اول تو اس طرح حیلے کر کے مچھلیاں پکڑیں ، پھر ہوتے ہوتے عام طور پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جماعتیں ہوگئیں ایک جماعت علماء و صلحاء کی تھی جنھوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا ، یہ باز نہ آئے تو ان سے برادرانہ تعلقات قطع کر کے بالکل الگ ہوگئے ،اور بستی کے دو حصے کر لئے ،ایک میں یہ نافرمان لوگ رہ گئے ، دوسرے میں علماء وصلحاء رہے، ایک دن ان کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصے میں یہ نافرمان رہتے ہیں ادھر بالکل سناٹا ہے تو وہاں جا کر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں مسخ ہو چکے تھے (تفسیر قرطبی بحوالہ معارف جلد اول)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ان کے جوان بندر بنا دیئے گئے اور بوڑھے خنزیر کی شکل میں منتقل کر دیئے گئے تھے، اور مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ داروں اور تعلق والے انسانوں کو پہچانتے تھے، ان کے قریب آ کر روتے تھے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی وضاحت میں لکھا ہے کہ سبت یعنی ہفتے کے دن بنی اسرائیل کے لئے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اس دن کو آرام اور عبادت کے لئے مخصوص کر لیں اس روز کسی قسم کا دنیوی کام حتی کہ کھانا پکانے کا کام بھی نہ خود کریں نہ اپنے خادموں سے لیں ، اس باب میں یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حرمت کو توڑے، وہ واجب القتل ہے ۔لیکن جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و دینی انحطاط اور زوال آیا تو وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے حتی کہ ان کے شہروں میں کھلے بندوں سبت

کے روز تجارت ہونے لگی۔

اس واقعہ کی تفصیل سورۂ اعراف میں بھی ہے، ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں مفسرین میں اختلاف ہے، بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہوگئی تھیں۔ لیکن قرآن کے ظاہری الفاظ اور انداز بیان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا، قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہ اسی حال پر رہنے دیئے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہوکر بندروں سے ہوگئے ہوں گے۔

امت محمد یہ پر اللہ کا فضل اور احسان ہوا کہ اس امت سے اس سخت حکم کو ہٹا دیا گیا اور جمعہ کا مبارک دن جو اصلاً مسلمانوں کے لئے ہفتہ کی عید ہے اور جس دن کو آپ ﷺ نے سید الایام کہا ہے اس دن نماز جمعہ سے پہلے اور اس کے بعد ہر طرح کی تجارت اور تلاش معاش کا حکم دیا گیا ہے۔ سورہ جمعہ آیت نمبر ۱۰۔۹ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ۱۰ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔

ناپاک کپڑا یا ناپاک بدن کے حصے کو کاٹنا: بنی اسرائیل کی مشکلات میں سے ایک حکم یہ بھی تھا کہ جب ان میں سے کسی کا کپڑا ناپاک ہوجاتا تو پانی سے دھونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ حکم شرعی تھا کہ جس جگہ نجاست لگی ہے اس حصہ کو کاٹ دیا جائے۔ جیسا کہ امام بخاریؒ نے یہ روایت نقل کی ہے..... ان بنی اسرائیل کا ن اذا أصاب ثوب احدهم قر ضه (بخاری ۲۲۶) یعنی بنی اسرائیل میں جب کسی کے کپڑے پر ناپاکی لگ جاتی تو اسے کاٹنا پڑتا تھا، اور امام ابوداؤد نے نقل کیا ہے "الم تعلموا ما لقی صاحب بنی اسرائیل کانوا اذا اصابهم البول قطعوا ما أصابه البول منهم فنهاهم فعذب فی قبره (ابو داؤد) کیا تم کو پتا ہے کہ بنی اسرائیل کو کس پریشانی کا سامنا کرنا پڑا؟ جب ان میں سے کسی کے بدن پر کوئی نجاست لگ جاتی پیشاب وغیرہ تو بدن کے اس حصہ کو کاٹنا پڑتا تھا تو ان لوگوں نے اس حکم کو نہیں مانا جس کی پاداش میں انھیں عذاب قبر سے دوچار ہونا پڑا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خاص فضل اور کرم ہوا کہ اس مشکل اور دشوار حکم کو اس امت سے ختم کر دیا گیا اور اس ناپاک کپڑے یا بدن کو پانی سے پاک کر لینے کا حکم دیا گیا۔ پانی مٹی دونوں سے پاکی حاصل ہونے کا شرف اس امت کے لئے خاص کیا گیا ہے۔

ایام ماھواری (MC) اور بنی اسرائیل کی مشکلات: بنی اسرائیل کی عورتوں کے لئے حکم شرعی تھا کہ یہودی عورتوں کو جب حیض (ماہواری) کا خون آتا تو ان کے شوہر اس کے ساتھ کھانا پینا رہنا سہنا بند کر دیتے، بلکہ ان عورتوں کو بالکل الگ تھلگ دور تنہا الگ کمرہ یا مکان میں رکھا جاتا۔

امام مسلم نے یہ روایت نقل کی ہے..... أن اليهود كانوا ، إذا حاضت المرأة فيهم ، لم يؤكلوا ها ولم يجامعوهن في البيوت فسأل اصحاب النبي ﷺ

فقال رسول اللہ ﷺ : اصنعوا کل شئی إلا النکاح ... .(مسلم ۶۹۴) یعنی یہود کے یہاں عورتوں کو جب حیض (MC) کا خون آتا تو ان کے ساتھ مرد نہ ہی ایک بستر پر سوتے نہ کھانا کھاتے تو صحابہ نے اس بارے آپ ﷺ سے عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا حیض کی حالت میں جماع کے علاوہ ہر چیز کی اجازت ہے۔

سچائی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امت وسط بنایا اور اس کے خمیر میں اعتدال و میانہ روی رکھ دی گئی ہے، اور فطری تقاضوں کی حدود میں رہتے بھرپور رعایت کی گئی ہے، یہ شریعت سہولتوں اور آسانیوں کے ساتھ انسانی زندگی کے لئے رہنمائی کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس امت میں افراط وتفریط مذموم ہے اور اعتدال و میانہ روی ہر جگہ مطلوب ہے۔ وسط دو کناروں کے بیچ اور درمیان کو کہا جاتا ہے اس لئے ہر محمود و مستحسن وصف دو مذموم خصلتوں کے بیچ میں ہوتا ہے ایک میں کوتاہی ہوتی ہے اور دوسری میں غلو، ایک جانب افراط ہوتا ہے اور دوسری جانب تفریط۔

قتل کی سزا بنی اسرائیل میں

شریعت موسوی میں میں قصداً اور خطأً دونوں صورتوں میں قصاص (جان کے بدلے جان) واجب تھا، دیت (خون بہا) کا کوئی حکم موجود نہ تھا۔ لیکن شریعت محمدی اور شریعت اسلامیہ میں قتل عمد (جان بوجھ کر قتل کرنا) کی صورت میں قصاص اور خطا کی صورت میں دیت کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر ورثۂ مقتول اس حق کو معاف کرنا چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔

امام بخاریؒ اپنی صحیح بخاری میں اس حدیث کو نقل کرتے ہیں.....کانت فی بنی اسرائیل القصاص ولم تکن فیھم الدیة .... (بخاری ۶۸۸۱) بنی اسرائیل میں قصاص کا حکم تھا اور دیت (جان کا مالی معاوضہ) کا حکم نہیں تھا۔

خلاصہ یہ کہ بنی اسرائیل میں بلکہ پچھلی تمام امتوں میں اللہ تعالیٰ نے قانون قصاص رکھا تھا بلکہ اس پر علماء امت کا اجماع ہے جیسا کہ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں نقل کیا ہے۔ لیکن دیت کا حکم سابقہ امتوں میں نہیں تھا اس کا حکم صرف امت محمدیہ کو خاص طور پر دیا گیا جو اس امت کی ایک اہم خصوصیت ہے جس سے سابقہ امتیں محروم تھیں۔

توبہ کی قبولیت کے لئے مجرم کا قتل جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی نصیحت وخیر خواہی کا ٹھکرا دیا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی یعنی بچھڑے کی عبادت شروع کر دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے توبہ کا یہ طریقہ بیان کیا کہ بے قصور آدمی قصور وار شخص کو قتل کرے جیسا کہ سورۂ بقرہ آیت نمبر ۵۴ ہے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ ”لوگو“ تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا، لہذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

نیز بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ حکم بھی تھا کہ جھوٹ بولنے پر زبان اور زنا کرنے پر شرم گاہ کو کاٹ دیا جاتا تھا۔

لیکن شریعت محمدی میں اگر کوئی گنہ گار شخص سچے دل سے توبہ کرے تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے جیسا کہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْيَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا(النساء۱۱۰)

اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگذر کی درخواست کرے تو اللہ تعالیٰ کو درگذر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مفتی شفیع صاحبؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔

قرآن کریم کے عام اسلوب حکیمانہ کے مطابق مجرموں گنہگاروں کو ناامیدی سے بچانے کے لئے فرمایا گیا، کہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا، جب گنہگار اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم پاتا ہے، اس میں ان لوگوں کو جن سے یہ گناہ سرزد ہوا تھا اس کی ترغیب ہے کہ باز آجائیں اور دل سے توبہ کرلیں تو کچھ نہیں بگڑا اللہ تعالیٰ سب معاف فرمائیں گے (معارف القرآن جلد دوم)

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ۔

اور بنی اسرائیل کے وہ احکام جو بطور سزا ان پر لازم کر دیئے گئے تھے وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس امت کے افراد کو یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر کتنا بڑا احسان اور فضل ہے کہ ان کو اس شریعت میں کس قدر سہولتیں اور آسانیاں دی گئی ہیں اور کس طرح اس امت کو پریشانی اور زحمت میں مبتلا ہونے سے بچایا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دین اسلام آسان ہے اور تمام شریعتوں کے مقابلے میں یہ شریعت آسان ہے جیسا کہ قرآن شریف کی یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے، یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (سورہ بقرہ ۱۸۵) ''اللہ تعالیٰ کو تمہارے لئے آسانی پیدا کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں''

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر جو بھی احکام نازل فرمائے ہیں اس میں سہولت یسر اور تخفیف کا پہلو نمایاں ہے اور عذر کا دروازہ کھلا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس امت کی اسی سہولت یسر اور تخفیف کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔ انی بعثت لحنیفیة السمحة (بخاری باب الدین یسر) کہ میں سیدھی اور آسان شریعت کے ساتھ بھیجا گیا ہوں، ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں "أحب الدين إلى الله الحنفية السمحة" ۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ اپنے قاصدوں اور عاملوں کو کسی علاقہ اور صوبہ میں روانہ فرماتے تو ان کو یہ خصوصی ہدایت فرماتے "بشروا ولا تنفروا يسروا ولا تعسروا" (ابوداؤد) آسانی اور سہولت کا معاملہ کرنا، سختی اور دشواری کی راہیں نہ نکالنا، محبت کا پیغام دینا نفرت کا سبب نہ بننا۔

اس امت کا امتیاز یہ ہے کہ تمام احکام شرعیہ کی مشروعیت میں تدریجی پہلو کو اپنایا گیا ہے، مثلاً نماز اور روزہ کے بہت سے مسائل میں مسافر اور بیمار کے لئے رخصت ومہلت، دیگر احکام میں بھی سہولت وتخفیف، حالت جنگ میں خصوصی احکام، ناکافی لباس ہونے کی صورت میں شریعت کی طرف سے آسانی بھول چوک اور نیند کے احکام اور حیض ونفاس کے احکام میں خصوصی رعایت وسہولت وغیرہ۔

(..... **جاری**)

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

صالح معاشرے کی تشکیل اور تعلیمات نبوی ﷺ

ظفر دارک قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبہ دینیات، اے ایم یو علی گڑھ
zafardarik85@gmail.com

آج پوری دنیا میں بدامنی اور خلفشار برپا ہے جس سے معاشرے کا سکون غارت ہورہا ہے، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہمارا واسطہ تعلیمات نبوی سے منقطع ہوچکا ہے۔ جب تک ہم اپنے معاشرے کی کردار سازی اور قول وعمل میں اخلاص پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک اسی طرح ظلم وعدوان اور جور وستم کے شکار رہیں گے۔ کیونکہ قرآن میں بجا طور پر ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے:

''فی الحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی ذات) میں نہایت ہی حسین نمونہ (حیات) ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ (سے ملنے) کی اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے''۔ (الاحزاب، ۳۳:۲۱)

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی معاشرے کے ان پہلوؤں اور مسائل پر روشنی ڈالی جائے جن کے بارے میں اسلام کی نہایت غلط تعبیر کی جارہی ہے اور فی زمانہ یہ موضوعات پوری دنیا میں زیر غور ہیں۔ اسلام چودہ صدیاں قبل بنی نوع انسان کو رشد و ہدایت دینے کے لیے آیا اور حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا لیکن آج بھی آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ تمام دنیا کے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انفرادی واجتماعی سطح پر انسانی زندگی کے ہر پہلو میں کئی گنا تبدیلی آنے کے باوجود آپ ﷺ کے سوا کسی اور شخصیت کی زندگی نمونہ حیات ہے نہ اسلام کے سوا کوئی مذہب کامل رہنمائی فراہم کرتا ہے ،اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور یہ سوال اس لیے نہیں کہ ہم بحیثیت مسلمان خود کو مطمئن کرسکیں بلکہ اس لیے بھی کہ اغیار کو اسلام کی عظمت کا قائل کیا جاسکے۔ آج ہماری زندگی کا سیاسی، عمرانی، نفسیاتی، مذہبی، یا اقتصادی کوئی بھی پہلو ہو ان تمام تبدیلیوں کے باوجود انسانیت آج بھی اسلام سے ہی ہدایت اور رہنمائی حاصل کررہی ہے۔ اس کے لیے ہمیں اُس دور اور معاشرے کا مطالعہ کرنا ہوگا جس میں آپ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ اسلام سے قبل خطہ عرب میں ہر سو ظلم و بربریت کا دور دورہ تھا۔ قبائلی عداوتیں اپنے عروج پر تھیں، اخلاق ومروت کا نام ونشان تک نہ تھا، انسانی حقوق اور تکریم کا تصور بھی نہ تھا یہاں تک کہ خواتین کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا اور بیٹیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا، معاشرے میں سچائی ورحم دلی اور علم کا نام ونشان بھی نہیں تھا، قوت حافظہ پر فخر کیا جاتا تھا،

صرف خاندانی تفاخر اور نسلی تعصب کو ترجیح دی جاتی تھی۔ بے حیائی اس قدر عام تھی کہ خانہ کعبہ کا طواف بھی عریاں حالت میں کیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب دیگر تمام ترقی یافتہ تہذیبیں دم توڑ چکی تھیں، جیسے مصری تہذیب اپنی تمام تر ترقی کے باوجود روبہ زوال تھی، اسی طرح یونانی، ایرانی اور ہندی تہذیبیں تھیں جو معاشرے میں اثر ورسوخ نہیں رکھتی تھیں۔

بنابریں رب کائنات نے بنی نوع انسان پر احسان فرمایا اور اپنے حبیب مکرم نبی آخر الزماں ﷺ کو رحمۃ اللعالمین ﷺ بنا کر بھیجا۔

تعلیمات نبوی کا اجتماعی خاکہ:

چنانچہ آپ ﷺ نے دنیا کو برابری، عدل وانصاف، قومی یکجہتی، تہذیب وتمدن، اخلاق حسنہ، معاشی، سیاسی، معاشرتی آزادی، سخاوت اور تحمل ورواداری کا درس دیا۔ آپ ﷺ نے تعلیمی انقلاب کی داغ بیل ڈالی اور معاشرتی مساوات، بھائی چارگی اور انسانی تکریم کے زیور سے مزین کیا، تصور کیجیے جس معاشرے میں تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ آپ ﷺ نے دنیا کو پہلی وحی سے ہی ایک رب کی پرستش کی تعلیم دی اور انہیں علم کی طرف راغب کیا۔ لوگوں کو لکھنے کی تعلیم دی اور انہیں Embryology سے متعلقہ مضامین سکھائے۔ گویا آپ ﷺ کو پہلا پیغام علم دیکر نوع انسانی کو شعور عطا فرمایا گیا اور اُسے تکریم انسانیت کی تعلیم دیکر فہم وشعور، غور وتفکر، عقل وتوازن کے انمول جواہر سے سرفراز فرمایا۔ ''اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی''۔ (بنی اسرائیل، ۱۷:۷۰)

پھر آپ ﷺ نے مساوات اور اخوت و بھائی چارے کی فضا قائم کی، جسے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا''۔ (الحجرات، ۴۹:۱۳)

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتدا ایک جان سے کی''۔ (النسا، ۴:۱)

آپ ﷺ نے معاشرتی و سماجی انصاف کا درس دیا:

''فرمادیجئے: میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے''۔ (الاعراف، ۷:۲۹)

آپ ﷺ نے آزادی کا تصور دیا:

''دین میں کوئی زبردستی نہیں''۔ (البقرۃ، ۲:۲۵۶)

یہ تو تھا اسلامی تعلیمات کا مجموعی خاکہ، اب اس کے چند اہم گوشوں پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کا تصور امن

پوری دنیا بالخصوص عرب معاشرہ تشدد وظلم، وحشت اور سفاکی سے بھرا ہوا معاشرہ تھا، لیکن حضور نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو امن وسلامتی عام کرنے پر زور دیا: اور فرمایا کہ سلام کو رواج دو سلامتی میں رہو گے (مسند احمد بن حنبل)

اس حدیث مبارکہ میں حضور نبی اکرم ﷺ نے امن و سلامتی، اخوت ومحبت اور بھائی چارگی کو اپنانے پر زور دیا۔ اور سلام کو عام کرنے پر زور دیا اور انہیں یہ نوید دی کہ اس طرح تم بھی دائرۂ امن میں آجاؤ گے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک ایمان نہ لاؤ اور تمہارا ایمان کامل نہیں ہوگا جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں کہ اسے کرو تو ایک

دوسرے سے محبت کرنے لگو گے؟ آپس میں سلام کو پھیلاؤ''
(سنن ابی داؤد کتاب الادب)

حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی ایک دوسرے مقام پر مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک اسلام نہ لاؤ اور تم اس وقت تک اسلام نہ لاؤ گے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ (لوگو!) سلام کو عام کرو تم باہم محبت کرنے لگو گے۔ اور بغض سے بچو کیونکہ یہ کاٹنے والا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمہاری گردنیں کاٹے گا بلکہ یہ تمہارا دین کاٹے گا''۔ (الادب المفرد)

ان احادیث میں اور دیگر کئی مواقع پر حضور نبی اکرم ﷺ نے اُس معاشرے کو امن وسلامتی عام کرنے کا حکم فرمایا جہاں جنگ و جدل انسانی گھٹی میں رچی بسی تھی۔ گویا آپ ﷺ کلی طور پر ایک پرامن، محفوظ، صالح معاشرے کا قیام چاہتے تھے، جہاں کسی کی جان مال، آبرو غیر محفوظ نہ ہو۔ ذرا غور فرمایئے کہ ان اقوال رسول ﷺ میں مسلمانوں کو باہمی تعلق اور ملاپ کا ایک واضح اور صاف ستھرا راستہ بتایا گیا ہے۔

جب کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ان یہودیوں کے ساتھ بھی نرمی اختیار کرنے کا حکم فرمایا جو آپ ﷺ کو بددعا دے رہے تھے۔

''حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ کچھ یہودی آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا: تمہارے اوپر موت ہو۔ حضرت عائشہ نے جواباً کہا: تمہارے اوپر بھی ہو اور اللہ تم پر لعنت کرے اور تم پر اللہ کا غضب ہو۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! جانے دو، کج خلقی اور بدگوئی سے بچو''۔ (صحیح بخاری)

بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر آپ ﷺ نے یثرب سے آئے ہوئے بارہ رکنی وفد سے جو تعلیمات ارشاد فرمائیں وہ صالح معاشرہ، امن وامان، پیار و وفا، خلوص وللّٰہیت، جذبہ خیر سگالی، قومی یکجہتی اخوت و محبت، مساوات اور نیکی جیسے اہم امور کی طرف نوع انسانی کی رہنمائی کرتی ہیں۔

۱- اللہ تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر ایمان لاؤ گے۔
۲- کبھی چوری نہیں کرو گے۔
۳- کبھی بدکاری نہیں کرو گے۔
۴- کبھی اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور نہیں کرو گے۔
۵- کسی پر بہتان نہیں باندھو گے۔
۶- جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اگر وہ اچھا ہے تو اس کی پیروی کرو گے۔

اگر ہم مذکورہ تعلیمات پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اہل مکہ کی دشمنی کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم ومصائب کا بدلہ لینے کا کوئی اشارہ دیا بلکہ آپ ﷺ نے ان کی اخلاقی، معاشرتی وسماجی اصلاح پر زور دیا اور انھیں تکریم انسانیت کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ یہ تعلیمات کا پہلا پیکج تھا جو یثرب سے آئے ہوئے پہلے وفد کو دیا گیا۔ بعد ازاں اس وفد نے یہ تعلیمات پھیلانا شروع کیں۔

جب آپ ﷺ مدینہ منورہ ہجرت فرما کر گئے تو اہل مدینہ کے دلوں میں آپ ﷺ کے لیے محبت کا سمندر موجزن تھا کیونکہ آپ ﷺ نے انہیں ان برائیوں سے نجات دلائی جو صدیوں سے ان کے اندر موجود تھیں۔ یہاں آپ ﷺ نے درج ذیل تعلیمات پر مشتمل پہلا خطبہ دیا:

۱- اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو تا کہ تمہارے اعمال کی اصلاح ہو سکے۔

۲- ہمیشہ ذہن نشین رکھو کہ تمہیں روز محشر اُس خدائے وحدہ لاشریک کے حضور اپنے اعمال پر جواب دہ ہونا ہے۔

۳- صدقہ وخیرات کی کثرت کرو۔

۴- اپنے رویہ اور باتوں میں ہمیشہ نرمی اور رحم دلی اختیار کرو اور اپنے دل کو سخت اور ظالم نہ ہونے دو۔

۵- نفرت کی بجائے ایک دوسرے سے محبت کرو۔

۶- اپنے نفس، دل اور ذہن کے شر انگیز پہلو سے پناہ مانگو۔

۷- قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کرو۔

۸- ہمیشہ اپنے وعدوں کی پاس داری کرو۔

مذکورہ تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ آپ ﷺ ایک کامیاب وکامران، تعمیری وفلاحی معاشرے کے خواہاں تھے، جس کی بنیاد غریب پروری اور احسان پر ہو۔ جہاں لوگ امن وآشتی اور صلح پسندی کے ساتھ رہیں، جہاں باہمی حقوق محفوظ ہوں، کسی کی حق تلفی نہ ہو، یہ تعلیمات آج کے روشن خیال رہنماؤں سے سوال کر رہی ہیں جو جہاد کے نام پر امت کے نوجوانوں اور پوری دنیا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ نیز یہ تعلیمات مغربی دنیا کے نام نہاد حکمرانوں کے منہ پر طمانچہ ہیں جو اسلام کو تشدد، دہشت گردی اور انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

آمد مدینہ اور اقدامات نبوی ﷺ

حضور نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ آمد کے بعد درج ذیل اقدامات کو تمام امور پر ترجیح دی۔ جو امن و امان، بھلائی وخیر خواہی، سکون واطمینان کا پیش خیمہ ہیں۔

۱- آپ ﷺ نے اہل مدینہ سے خطاب فرماتے ہوئے باہمی محبت و یگانگت کے فروغ اور لوگوں کو اپنے قول وفعل اور رویے میں نرمی اور رحم دلی اختیار کرنے کا حکم دیا۔

۲- اس کے بعد آپ ﷺ نے جو پہلا کام کیا وہ مواخات کا تھا، جس کے ذریعے آپ ﷺ محبت، اخوت اور امن کی بنیاد پر سماجی استحکام چاہتے تھے۔

۳- مواخات کے بعد جو کام آپ ﷺ نے کیا وہ مدینہ کے یہود اور دوسرے غیر مسلم قبائل کے ساتھ سیاسی معاہدۂ امن تھا، جس کے ذریعہ آپ ﷺ نے ریاست مدینہ کو وہ آئین دیا جو کہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، روحانی، معاشی، مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور دیگر فلاحی شعبوں پر محیط ہے۔

تاریخ عالم میں آئین سازی

اگر ہم دنیا کی آئینی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اس سے بھی دستور مدینہ کی اہمیت وافادیت دوچند ہو جاتی ہے۔

برطانیہ میں آئینی تاریخ کا آغاز ۱۲۱۵ء میں میگنا کارٹا کی صورت میں ہوا جس میں محدود سطح پر حقوق دیے گیے، بعد ازاں Bill of Rights آیا جس کے بعد ۱۷۰۰ء میں Act of Settlement پاس ہوا۔

اسی طرح امریکہ کی آئینی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۷۶ء میں Declaration of Indpendence بنا۔ پھر ستمبر ۱۷۸۷ء میں Philadelphia Convention میں امریکہ کا پہلا آئین وجود میں آیا۔ اس دوران آئینی طور پر غلامی برقرار رہی۔ ۱۸۶۸ء میں تیرھویں اور چودھوں ترمیم کے ذریعہ بنیادی انسانی حقوق کو آئین کا حصہ بنایا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں

انیسویں ترمیم کے ذریعہ عورت کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا۔ یہی حالات آسٹریلوی، فرانسیسی اور جرمن سیاسی نظاموں اور آئین کے ہیں۔اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مذکورہ آئین پورے طور پر انسانیت کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں، مگر حضور ﷺ نے دنیا کو پہلی ہجری میں جو دستور دیا وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر مکمل ومدلل رہنمائی فرماتا ہے۔

تاریخ اسلام میں آئین سازی

اس ضمن میں ہم اسلامی آئین سازی کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ مغربی دنیا میں تمام حقوق کو آئینی تحفظ پچھلے ڈیڑھ دوسوسال کے عرصے کے دوران حاصل ہوا جب کہ اسلامی تاریخ میں حضرت محمد ﷺ نے چودہ صدیاں قبل ۵۵ شقوں پر مشتمل دنیا کا پہلا تحریری دستور دیا۔اس آئین کے ذریعے آپ ﷺ نے تمام قوموں اور قبائل، مسلم، یہودی، عیسائی وغیرہ ان تمام کو ایک قوم قرار دیا۔آپ ﷺ نے ریاست مدینہ کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیا۔ Devolution کے ذریعہ حکومت کو وفاقی، صوبائی اور لوکل سطحوں پر قائم کیا۔اُس دور میں پہلی آئینی اسمبلی قائم ہوئی اور قوموں کو عدل وانصاف کا تصور اس زمانے میں دیا جب بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا اور پوری دنیا تہذیب اور انسانی حقوق وقانونی دستور کے تصور سے ناآشنا تھی۔مقامی وقومی وخاندانی رسوم و روایات کو آئینی تحفظ دیا گیا۔تمام مذاہب کے پیروکاروں کو مذہبی آزادی دی گئی اور دہشت گردی کی تمام راہیں قانونی طور پر ختم کردی گئیں۔آئین مدینہ کی دفعہ نمبر ۱۶ کے ذریعے دہشت گردی اور انتہاپسندی کے خلاف اجتماعی ردعمل کا اظہار ضروری قرار دیا گیا اور مدینہ کی حدود کے اندر قتال، دہشت گردی اور ظلم کو جرم عظیم قرار دیا گیا۔

ان تمام تصریحات کے بعد جب ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑاتے ہیں تو نہایت کرب ناک منظر دکھائی دیتا ہے کہ چند لوگوں اور گروپوں کی طرف سے اسلامی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا ہے جس سے تعلیمات نبوی کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مغرب اور آزادئی نسواں

برطانیہ میں عورت کے حق رائے دہی کے لیے جدوجہد کا آغاز ہی ۱۸۹۷ء میں Millicent Fawcett نے National Union of Womens Sufferage کے قیام سے کیا، یہ تحریک اس وقت زیادہ زور پکڑ گئی جب ۱۹۰۳ء میں Emmeline Pankhurst نے Woman's social and Political Union بنائی اور یہ یونین بعد میں Suffragettes کے نام سے مشہور ہوئی۔

برطانیہ کے House of Commons نے ۱۹۱۸ء میں ۵۵ کے مقابلہ میں ۳۸۵ ووٹوں کی اکثریت سے Representation of people Act پاس کیا جس کے مطابق ۳۰ سال سے زائد عمر کی خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا۔اگرچہ یہ خواتین کے حق رائے دہی کے اعتراف کا نقطہ آغاز تھا مگر ابھی عورتوں کو مردوں کے برابر مقام نہیں دیا گیا تھا، کیونکہ عام مردوں کے لیے حق رائے دہی کی اہلیت ۲۱ سال اور مسلح افواج کے لیے ۱۹ سال تھی۔

امریکہ میں ۴/جولائی ۱۷۷۶ کا اعلان آزادی the Declaration of Indepedence جدید جمہوری

معاشرے کے قیام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، مگر اس میں بھی عورت کو بنیادی انسانی حقوق کے قابل نہیں سمجھا گیا، Richard N.Current کے مطابق نوآبادیاتی معاشرے کی عورت ہر طرح کے حق سے محروم تھی۔

اسی طرح جب جیفرسن (Jefferson) نے اعلان آزادی میں The People کا لفظ استعمال کیا تو اس سے مراد صرف سفید فام آزاد مرد تھے۔ اور آج دو صدیوں بعد بھی امریکہ میں عورت مساوی آزادی و مساوات کے لیے کوشاں ہے۔ کیونکہ اس ڈیکلیریشن میں Men یا him کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، Woman کے نہیں۔ جان بلم کے الفاظ میں ''پرانے امریکی مرد خواتین کو اپنے مساوی نہیں تسلیم کریں گے''

یہی وجہ ہے ء کہ ۱۹۴۸ء میں SenecFalls میں ہونے والے تاریخی NewYork Woman's Right Convention کے لیے Declaration of Sentiments لکھتے ہوئے Elizabeth Cady Stanton نے اس بات پر زور دیا کہ اعلان آزادی میں عورت کے نجی عمومی مطالبے بھی شامل کیے جائیں۔

انیسویں صدی میں امریکہ کی عورتوں کو حقوق کی علم بردار SusanBAnthony کو ۱۸۷۲ء میں صدراتی الیکشن میں ووٹ ڈالنے پر گرفتار کرلیا گیا اور ایک سو ڈالر کا جرمانہ بھگتنا پڑا کیونکہ اسے قانونی طور پر حق رائے دہی حاصل نہیں تھا۔

Susan B Anthony نے امریکی آئین کے دیباچہ کے درج ذیل مندرجات کی روشنی میں یہ موقف اختیار کیا کہ آئین کی رو سے عورت بھی ایک فرد ہے جسے تمام آئینی حقوق حاصل ہونے چاہئیں: ہم متحدہ ریاستوں کے عوام ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین کی تشکیل اور نفاذ کریں تاکہ زیادہ مکمل یونین تشکیل دی جاسکے، انصاف قائم ہو داخلی امن واستحکام یقینی بنایا جائے، مشترکہ دفاع مہیا ہو فلاح عام کا فروغ ہو اور اپنے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے آزادی کی نعمت کا تحفظ کیا جائے۔

۴/جون ۱۹۱۹ء کو امریکی کانگریس اور سینٹ نے امریکی آئین کا ۱۹واں ترمیمی بل منظور کیا جس میں یہ قرار پایا:

''آرٹیکل ۱۹: کوئی ریاست یا متحدہ ریاستیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شہریوں کا حق رائے دہی جنس کی بنیاد پر ختم نہیں کریں گی۔''

گویا امریکہ میں خواتین کو ۱۹۲۰ء تک رائے دہی کا حق حاصل نہ تھا جب انیسویں آئینی ترمیم منظور ہوئی جس کے تحت یہ حق دیا گیا۔ اسی طرح فرانس میں ۱۹۴۴ء میں عورتوں کو حق رائے دہی دیا گیا۔

آسٹریلیا میں ملک گیر سطح پر خواتین کو رائے دہی کا حق ۱۹۲۶ء میں دیا گیا۔ جبکہ آسٹریلوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے والی پہلی خاتون Edith Cowan تھی جو مغربی آسٹریلیا کی قانون ساز اسمبلی کی ۱۹۲۱ء میں رکن منتخب ہوئی۔

یہی حال دیگر مغربی ممالک کا ہے جہاں پچھلی ایک ڈیڑھ صدی میں عورت کو قانونی شخص تسلیم کیا گیا اور پچاس سو سال قبل اسے حق رائے دہی دیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب میں تحفظ عورت کا نظریہ عرصہ دراز تک التوا میں پڑا رہا اس کے باوجود بھی اسلام کی آزادی اور عصمت النساء پر کیچڑ اچھالتے ہیں، جو آزادی عورتوں کو

اب جا کر حاصل ہوئی ہے وہ اسلام نے پہلی ہجری میں ہی عطا کر دی تھی، نیز اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ اسلام نے آج سے ۱۴ سو سال قبل ہی ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے حقوق نہ صرف واضح فرما دیے بلکہ ان حقوق کی ادائیگی کی تاکید بھی کی۔ انہی انسانی حقوق میں سے اسلام نے عورتوں کے حقوق کی بھی حفاظت کی اور اپنی تعلیمات میں انہیں واضح انداز میں بیان بھی کیا۔

اسلام اور آزادئی نسواں

اسلام نے آج سے چودہ صدیاں قبل عورت کو مساوی حقوق دیے، نسلی امتیاز ختم کرتے ہوئے حق رائے دہی اور عورت کو انفرادی و اجتماعی حقوق دیکر ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے عائلی حقوق کا ذمہ دار بنایا، اسی طرح ازدواجی ،معاشی وسیاسی اور قانونی حقوق بھی مرحمت فرمائے۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے وقت مرد وعورت نے یکساں طور پر حق رائے دہی استعمال کیا۔ نیز خواتین کی سیاسی مشیر کے طور پر تقرری کی گئی۔ اور مختلف انتظامی ذمہ داریوں پر اس کی تعیناتی کی گئی۔ عورت کو دفاعی ذمہ داریوں میں نمائندگی دی گئی۔ ملٹری آفیسرز کے طور پر ذمہ داریاں دی گئیں۔

عورت کی دی ہوئی امان کو مرد کی امان کے برابر قرار دیا گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''عورت پوری قوم کے لیے امان دے سکتی ہے یعنی مسلمانوں کی طرف سے امان دے سکتی ہے''۔ (جامع ترمذی)

عورت کی امان کا صحیح ہونا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں ایک عام بات تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: ''اگر کوئی عورت (مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف بھی) کسی کو امان دے دے تو جائز ہے'' (سنن ابی داؤد)

اسی طرح اسلامی معاشرے میں عورت کو پارلیمنٹ میں بھی نمائندگی دی گئی ایک موقع پر جب حضرت عمر فاروقؓ نے مجلس شوریٰ سے عورتوں کے مہر کی مقدار متعین کرنے پر رائے لی تو مجلس شوریٰ میں موجود ایک عورت نے کہا آپ کو اس کا حق اور اختیار نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تب بھی اس میں سے کچھ واپس مت لو، کیا تم ناحق الزام اور صریح گناہ کے ذریعے وہ مال (واپس) لینا چاہتے ہو'' (النساء ۴:۲۰)

اس پر حضرت عمرؓ نے اپنی تجویز واپس لے لی اور فرمایا: ''عورت نے صحیح بات کی اور مرد نے غلطی''۔ (شوکانی، نیل الاوطار)

یہ عورت کو اسلام کی عطا کردہ عزت اور تکریم ہی تھی جس سے وہ معاشرے کا ایک موثر اور باوقار حصہ بن گئی اور اس نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سیاسی وانتظامی اور سفارتی کردار کے علاوہ تعلیم وفن کے میدان میں بھی عورتیں نمایاں مقام کی حامل تھیں، روایت حدیث، قرآن وکتابت شعر وادب اور دیگر علوم وفنون میں بھی بے شمار خواتین مہارت اور سند کا درجہ رکھتی تھیں۔

یہ ہے سیرت نبوی کا وہ پہلو جسے اغیار نے آج تک دبا کر رکھا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ حضور ﷺ کی ان تعلیمات کو اجاگر کریں جن پر معاندین اعتراضات واتہام کی یورش کرتے ہیں۔ تبھی جا کر صالح وصحت مند معاشرے کا وجود ممکن ہے۔

☆☆☆

فکر اسلامی

(قسط-۴)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

مغربی نظام تعلیم کا مہلک نتیجہ

مولانا کی بلاد عرب سے دلچسپی کا راز ان کی دعوت اور ان کی مصلحانہ ومفکرانہ فکر میں مضمر ہے، وہ اسلام کی قیادت پر مکمل یقین رکھتے تھے اور اس کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے کہ عرب پھر سے اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کریں، اور اس دنیا کی قیادت کا بار اٹھائیں، مولانا کی زیادہ تر تحریروں اور تقریروں کا مرکزی نکتہ عربوں کی اصلاح اور اسلام پر ان کے اعتماد کو بحال کرنا ہے،

آج اسلام پر یہ بے اعتمادی اور زیادہ بڑھ گئی ہے، بعض نوجوان تو یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ اب صرف یہ غور کرنا چاہیے کہ کون سی چیز ہے جس نے امریکہ کو سپر پاور بنا دیا ہے، افسوس کہ انہیں ایک لمحہ بھی یہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا کہ کبھی وہ بھی تو سپر پاور تھے، اس صورت حال، اسکے تدارک اور اس کے پیدا ہونے کے خطرے کا مولانا نے صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے:

''میں شروع سے اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ ممالک اسلامیہ بالخصوص ممالک عربیہ کی موجودہ صورت حال عقائد کا تزلزل، ذہنی انتشار، اخلاقی انارکی، اور اسلام کی قائدانہ صلاحیت کے بارے میں بے اعتمادی اور اس کے مستقبل سے مایوسی اس نظام تعلیم کا نتیجہ یا عطیہ ہے جو مغرب سے بغیر کسی بنیادی تبدیلی اور مجتہدانہ فکر ونظر کے درآمد کیا گیا ہے، میرا شروع سے خیال رہا ہے کہ نظام تعلیم وہ لباس ہے جس کو اس ملت اور نسل کے قد وقامت، سائز، اس کے ماضی اور حال اور اس آب وہوا کے مطابق تیار ہونا چاہیے، جس میں یہ ملت اور نسل پیدا کی گئی ہے، اور اسی میں اس کو جینا مرنا ہے، نیز اس میں صرف اس کے ''قامت'' ہی کا لحاظ ضروری نہیں ''قیمت'' کا بھی لحاظ ضروری ہے، اور جہاں تک ملت اسلامیہ کا تعلق ہے، اس کی ''قیمت'' (وزن وافادیت) اس کے ''قامت'' (تعداد اور سیاسی حیثیت) سے زیادہ اہم اور قابل لحاظ ہے، یہ نظام تعلیم حال کو ماضی سے اور پھر ان دونوں کو مستقبل سے مربوط کرنے کا مؤثر اور پائیدار ذریعہ ہے، اور اس کا اصل مقصد ان عقائد اور حقائق پر اس نسل کے عقیدے اور رابطہ کو نہ صرف مضبوط کرنا ہے، بلکہ ان کے لئے علمی بنیادیں اور دلائل فراہم کرنا اور ان کو صالح اور افضل ثابت کرنا ہے، جن سے اس ملت کا قوام اٹھایا گیا ہے، اور اس کو ان کا علمبردار بنایا گیا ہے، یا اس کو وہ بہر حال عزیز ہیں، اور جو نظام تعلیم اس مقصد کی نہ صرف یہ کہ تکمیل نہیں کرتا بلکہ اس کو نقصان پہونچاتا ہے (اور اس سے بھی زیادہ سنگین صورت یہ ہے کہ ان کے خلاف باغی

بناتا ہے) وہ نظام تعلیم اس ملت و نسل کا سب سے بڑا دشمن، اس کی متاع عزیز کا رہزن، اور سیاسی فتوحات اور غلبے سے بھی زیادہ اس ملت کے حق میں سم قاتل ہے۔

میں اس موضوع پر مختلف اوقات میں تحریری وتقریری طور پر اظہار خیال کرتا رہا، میرے نزدیک ممالک اسلامیہ میں سیاسی وفوجی انقلابات، حکومتوں اور عوام کے درمیان وسیع خلیج اور ان میں عدم استقرار کا بڑا سبب یہی ہے کہ ملت کے عقائد، جذبات، احساسات اور ضروریات اور ہیں، اور ان حکومتوں کا باہر سے درآمد کیا ہوا نظام تعلیم نہ صرف یہ کہ ان عقائد وجذبات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، بلکہ ان کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہے، اور پھر اس ملبہ پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے، اس طرح مسلم ممالک کی کیفیت اس سواری کی طرح ہوگئی ہے، جس میں دو مخالف سمتوں میں گھوڑے جوت دیئے گئے ہیں، یا انجن فٹ کر دیئے گئے ہیں۔'' (کاروان زندگی ج ۲ ص ۳۸-۳۹)

اپنے تشخص کی حفاظت کے لئے نظام تعلیم کا کردار:

مولانا نے بلاد عربیہ کو نظام تعلیم کے سلسلہ میں بہت صاف صاف مشورے دیے اور ان کو یہ باور کرایا کہ یہودی اپنے تشخص کو عام کرنے کے لئے کس قدر کوشاں ہیں، یہ کام اگر نہ ہوا یعنی نظام تعلیم کو اسلامی تعلیمات اور اس کے اصولوں کا پابند نہ بنایا گیا تو اپنی تاریخ اور اپنے تشخص سے ہاتھ دھونا پڑے گا ظاہر ہے یہ بات عرب ممالک کے نظام کو مخاطب کر کے کہی گئی لیکن ہمارے یہاں تو نظام ونصاب کا مسئلہ وہاں سے زیادہ خطرناک ہے، اس لیے ہمیں بھی بہر حال اس سمت میں سوچنے اور اقدام کرنے کی ضرورت ہے:

''جس میں میں نے مغربی ماہرین تعلیم کے اقوال سے ثابت کیا تھا کہ نظام تعلیم اس تیار کردہ سامان، لباس اور سہولتوں کی طرح نہیں ہے، جو کسی ملک سے درآمد کی جاتی ہیں، اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو وہ قوم اپنے پورے قدیم ورثہ اور اپنے ملی تشخصات سے محروم ہوجاتی ہے، یا سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے، پھر میں نے عربوں کے احساسات اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے بتایا کہ اسرائیل میں دینی تعلیم اور اپنی ملی تشخصات کی حفاظت کا کس قدر اہتمام ہے، اور وہ اس بارے میں کتنا غیور اور ذکی الحس واقع ہوا ہے، میں نے ''اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم'' کے ایک مضمون سے (جو ایک تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں آیا تھا) ایک اقتباس پڑھ کر سنایا کہ اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہودی عقائد کو غذا پہونچانا اور اس کے نشوونما اور ارتقاء کے لئے کوشش کرنا اور نئی نسل کو عمر بھر اس کا وفادار رہنا سکھانا ہے، پھر میں نے ثابت کیا کہ کثیر التعداد جامعات کا قیام اور اعلیٰ تعلیم مرض کی ہرگز دوا نہیں ہے، وہ کبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کو اخلاقی پستی اور نفس پرستی سے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ قوموں کو قوم پرستی، نسل پرستی اور عالمگیر جنگوں سے روک نہیں سکی، پھر میں نے اخیر میں صفائی کے ساتھ کہا کہ یاد رکھنا چاہیے کہ جزیرۃ العرب کی یہ سرزمین اور یہ تمدن وترقی اور اس سرزمین پر قائم ہونے والی حکومتیں بعثت محمدیؐ کا صدقہ اور اس کی دین ہے، اور اس سرزمین پر اسلام کو ابدی طور پر مالکانہ اور قائدانہ حقوق واختیارات حاصل ہیں، اور یہ اپنے پورے طول وعرض کے ساتھ اس کا حرم اور اس کا قلعہ ہے، اس لئے یہاں کسی کو باہر سے درآمد کئے ہوئے فلسفوں کی تبلیغ یا ترسیخ کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اور نہ ان بنیادوں پر تیشہ چلانے کی جو

صحابہ کرامؓ اور داعیان ومجاہدین اسلام نے تعمیر کیں، جس ''دانشور''، ''معلم''، ''مفکر'' اور مصنف کو اس سے اتفاق نہ ہو وہ اس سرزمین کو خیر باد کہے اس کے لئے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے پوری دنیا پڑی ہے، یہاں اس کو اس تخریبی اور انتشار انگیز عمل کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کہ بقول اقبالؔ ؎

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

(کاروان زندگی ج ۲ ص ۴۰-۴۱)

ایک حقیقت

سب بخوبی واقف ہیں کہ حضرت مولاناؒ نے عرب دنیا کو اپنے اصل میدان دعوت کے طور پر منتخب کیا تھا اور یہ بھی آپ نے صاف لکھا ہے کہ ''میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے''، یہی وجہ ہے کہ وہاں کے حالات پر وہ گہری نظر رکھتے تھے اور ان کو اس مقدس سرزمین سے بے پناہ دلچسپی تھی لیکن آپ نے کبھی بھی اپنی انا، خودداری اور دعوتی ذمہ داری سے مصالحت نہیں کی، چنانچہ عرب قومیت کی مخالفت میں آپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست نے آپ کے قلب ودماغ کو بے حد متاثر کیا، مولانا نے شکست کے حقیقی اسباب کی واضح انداز میں نشاندہی کی، مضامین لکھے، رسائل شائع کیا، بیانات دیے اور عرب شاہوں کو کھلا خط لکھا، اس زمانہ میں مولانا کا پاسپورٹ مصر اور ناصر پر سخت تنقیدوں کے باعث ضبط تھا، جب وہ واپس ملا اور عربوں کی شکست کے بعد مولانا کا پہلا سفر حجاز کا ہوا تو وہاں مولانا کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور پھر انہوں نے اپنے محاضرات میں صاف صاف باتیں کیں، کوئی رعایت اور کوئی مصلحت زبان حق ترجمان کو نہ روک سکی، مکہ معظمہ میں ''سود وزیاں کی میزان'' کے عنوان سے تقریر کی، اس کے اگلے سال مدینہ میں ''فتح وغلبہ کے دو الٰہی نظام'' میں صاف صاف باتیں کیں، اور پھر اسی سفر میں کویت میں جو تقریر کی وہ حقیقت بیانی اور فرض منصبی کے باعث واضح نقد سے لبریز تھی، مولانا کے الفاظ میں ''جس کا عنوان اور روح تھی عالم عربی کو اصل خطرہ اسرائیل سے نہیں اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام چھوڑ دیا'' (ج ۲ ص ۷۶) پھر ۱۹۶۹ء میں مدینہ میں ''المیہ فلسطین سے تین سبق'' کے عنوان پر اہم خطاب کیا اور اقبال کا یہ شعر پیش کیا:

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اول، طاؤس ورباب آخر

اس سلسلہ میں مولانا کا جو سب سے جرأت مندانہ اقدام تھا اور جسمیں صبر وضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے اور دو دو چار کی طرح مولانا نے اس شکست کے اسباب اور عربوں کی زندگی اور خود سعودی عرب کے اندر وہاں کی روزمرہ کی زندگی پر سخت تنقید کی، وہ مولانا کا وہ انٹرویو ہے جو سعودی عرب کے سب سے بڑے اخبار ''الندوہ'' نے ۱۷/اکتوبر ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں شائع کیا، ذیل میں دو سوال اور ان کے جواب نقل کیے جاتے ہیں:

''س: آپ کی آمد اس المیہ کے بعد ہو رہی ہے، کیا آپ نے یہاں کے لوگوں میں اس کا گہرا اثر پایا؟

ج: آپ نے میرا زخم کرید دیا، میرے رنج بھرے احساس کو چھیڑ دیا، اور اب میں جو کچھ بھی کہوں اس کو کہلانے کے

ذمہ دار آپ ہیں، اس لئے مجھے امید ہے کہ ناراض نہ ہوں گے۔

میں نے اس حادثہ کا کوئی خاص اثر اس ملک کی زندگی میں نہیں دیکھا، یہاں زندگی کا چکر اسی انداز پر چل رہا ہے، جو اس واقعہ سے پہلے دیکھنے میں آتا تھا گویا کوئی حادثہ ہی نہیں ہوا، ہماری عزت کو کوئی چوٹ ہی نہیں پہونچی، کوئی مقدس چیز ہم سے نہیں چھنی، نہ ہم نے اپنی آبرو اور قیمت میں سے کچھ کھویا ہے، نہ کوئی خطرہ ہمارے وجود اور ہماری غیرت کو چیلنج کر رہا ہے، حالانکہ جو کچھ ہو گیا اور جس کا آگے خطرہ ہے اس کا حق تھا کہ نیندیں اڑ جائیں، عیش مکدر ہو جائے، اور انسان اپنے آپ تک کو بھول جاتا۔

آخری سوال: اچھا تو اس شکست کے آثار و نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی واحد سبیل کیا ہے؟

جواب: واحد سبیل اسلام ہے "إلی الاسلام من جدید" نئے سرے سے اسلام پر آیئے! میں ان سطحی تجاویز سے بالکل مطمئن نہیں ہوں، جو آج بہت سے اہل قلم اور مفکرین پیش کر رہے ہیں، میں ان سیاسی کانفرنسوں اور ڈپلومیٹیک اجتماعوں پر بھی کوئی عقیدہ نہیں رکھتا جن کو ہم بہت آزما چکے ہیں، اور نہ فلسطین اور بیت المقدس کو تکیہ کلام بنانے میں کوئی فائدہ سمجھتا ہوں، جس کا ہر خطیب اور ہر صاحب قلم عادی ہو گیا ہے، ضرورت جس چیز کی ہے اور جس سے کام چلے گا، وہ ہے ایک نئی مومن نسل، جو نہ ذلت برداشت کرے، نہ بے فکری کے مشغلوں سے دل بہلائے، ایسی نسل جس کی زندگی سنجیدگی اور دلیری کی صفات و عقیدہ سے آراستہ ہو، جو صورت اسلام کی نہیں، حقیقت اسلام کی حامل ہو، یہی نسل ہے جو فتح و نصرت کی ضامن ہوگی، اور عزت و سربلندی اس کا مقدر ہے۔

پس ہماری صحافت و ادب، ریڈیو اور نظام تعلیم و تربیت اور قومی رہنمائی کی وزارت جیسے ہر مؤثر ادارہ کو اس نسل کی تعمیر میں حصہ لینا چاہیے، ہم میں جو کچھ دین و کردار و شرافت اور شجاعت کا جوہر باقی ہے، اس کی مکمل حفاظت کی جانی چاہیے کہ اس سے کوئی کھلنڈرا کھیلنے کی جرأت نہ کر سکے، یہ اگر بالکل رخصت ہو گیا تو لوٹ کر آنے والا نہیں، یہ اس نبوت کی وراثت ہے، جو حضرت محمد ﷺ پر ختم کی جا چکی ہے، یہ مصلحین و مرشدین کی باقیات صالحات میں سے ہے، اور یہ اس ملک کی وہ دولت ہے جسے یہ اطراف عالم میں برآمد کیا کرتا تھا"۔

(کاروان زندگی ج۲ ص۸۱)

علم ایک اکائی ہے

مولانا غالبا برصغیر کے پہلے عالم دین ہیں جن کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ علم ایک اکائی ہے، اسمیں ثنویت کی کوئی جگہ نہیں اس کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا، مولانا کے نزدیک علم کی تقسیم اور منقسم نظام تعلیم ہی بلاد اسلامیہ میں پائی جانے والی ذہنی کشمکش کا اصل سبب ہے:

"اسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی، اور بتایا گیا کہ موجودہ نظام تعلیم نے ملت اسلامیہ کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے، جو نہ صرف ایک دوسرے سے بیگانہ بلکہ نبرد آزما ہیں، اور یہی ان ممالک کی بے چینی ہے، آئے دن انقلاب اور حکمراں طبقہ کی توانائیوں کے ضائع ہونے اور بے محل صرف ہونے کا سبب ہے، جو ملت کے سینہ کے ایمانی آبشار سے بجلی اور توانائی پیدا کرنے کے بجائے ہر وقت اس کو روکنے اور سینہ میں گھٹے اور بھچے رہنے پر اصرار کرتا رہتا ہے" (کاروان زندگی ج۲ ص۲۶۴)

☆☆☆ (.....**جاری**)

نقطۂ نظر

اپریل فول کی حقیقت

محمد سلمان دہلوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء

اس وقت ہمارا معاشرہ جہاں بہت سی برائیوں میں گھرا ہوا ہے، ان میں سے ایک سب سے اہم برائی، جھوٹ، وعدہ خلافی اور دروغ گوئی ہے، یہ شیطان اور نفس امارہ کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی حقیقت کو آشکارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "إنما يأمركم بالسوء والفحشاء وأن تقولوا على الله مالا تعلمون" (بقرہ۱۶۹) (تم کو شیطان برائی اور بے حیائی اور اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم اللہ پر ایسی بات کہو جو جانتے نہیں ہو)

مذکورہ بالا خصلتوں کو حدیث شریف میں نفاق کی علامت بتایا گیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے اربع من كن فيه كان منافقا خالصا، ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق، حتى يدعها، إذا اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر۔ (رواہ البخاری) (جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ پکا منافق ہوگا، اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ وہ اس سے باز آجائے، جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب معاہدہ کرے تو معاہدہ شکنی کرے اور جب کسی سے جھگڑے تو گالی گلوچ پر اتر آئے)

شراحِ حدیث اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ منافق کا حال گوہ کی طرح ہوتا ہے جس طرح گوہ شکاری کو دھوکہ دیتا ہے اسی طرح منافق مسلمانوں کو دھوکہ دیتا ہے، لیکن آپ اپنے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں لاسکتے کہ عرب قوم کے اندر گرچہ شراب نوشی، قمار بازی اور دیگر برائیاں عام تھیں، مگر وہ دل کے بہت صاف اور سادہ لوح تھے اور مذکورہ بالا امور کو بہت غلط تصور کرتے تھے۔ جد بن قیس الانصاری کا واقعہ ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے تمام صحابہ کو بیعت کے لئے بلا بھیجا تو تمام لوگوں نے آپ ﷺ سے بیعت کی، مگر جد بن قیس الانصاری اونٹ کے پیچھے جا کر چھپ گیا، اس نے سوچا کہ اگر آج میں بیعت کر لیتا ہوں تو ان کی پیروی کرنی پڑے گی، لہذا اس نے بیعت نہیں کی کیوں کہ اصلا وہ منافق تھا۔

مگر آج کی مسلمان قوم اگر صبح بھی کرتی ہے تو جھوٹ سے اس کی ابتداء ہوتی ہے اور شام ہوتے ہوئے نامعلوم کتنے جھوٹ صادر ہوتے ہیں، مندرجہ ذیل تاریخی واقعہ موجودہ دور کے مسلمانوں کے لئے بطور خاص بڑا عبرتناک ہے، یہ واقعہ حدیث وسیرت کی ہر کتاب میں موجود ہے، طویل بھی ہے اور مشہور بھی، مجھے یہاں موضوع کی مناسبت سے اس کے ایک حصہ سے غرض ہے۔ حضرت ابوسفیانؓ قبل از اسلام اپنے ایک

تجارتی وفد کے ساتھ شام کے سفر پر تھے یہ صلح حدیبیہ کے زمانے کی بات ہے اسی دوران حضور اکرم ﷺ کا نامۂ گرامی شاہ روم ہرقل کے نام پہونچا، ہرقل نے تحقیق حال کے لئے ان کو وفد کے ساتھ دربار میں طلب کیا اور یہ تاکید کر دی کہ اگر ابوسفیان کذب بیانی سے کام لیں، تو ان کی قوم ان کو جھٹلائے، خود حضرت ابوسفیان کا بیان ہے کہ اگر شرم مانع نہ ہوتی کہ ہمارے ساتھی اس مجلس کے بعد کذب بیانی پر عار دلائیں گے تو میں اس وقت ضرور جھوٹ بولتا، حافظ ابن حجرؒ نے اس پر تحریر فرمایا ہے کہ ابوسفیان کے اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ عرب جھوٹ وافترا پردازی کو کتنا ناپسند کرتے تھے، لیکن کیا کیا جائے، نیرنگئ زمانہ دیکھیے، اور انقلاب دہر پر نظر ڈالیے کہ اسی جھوٹ وافتراء پردازی کو نئی نسل نے اس طرح اختیار کر رکھا ہے کہ یہ جزء حیات بن کر رہ گیا ہے اور اس کی شناعت بھی قلب وذہن میں باقی نہ رہی اور آج امتِ مسلمہ کو اسی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

جھوٹ ایک فیشن ہو گیا ہے اسی کا ایک سنہرا عنوان ''اپریل فول'' بنا دیا گیا ہے، جس کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بہت سے مسلمان بھی اس میں مبتلا ہو گئے ہیں، جبکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اندلس کی سرزمین پر مسلمانوں کے عہد میں عیسائی آباد تھے، ان عیسائیوں کو خدشہ لاحق ہونے لگا کہ مسلم حکومت ہم پر حاوی نہ ہو جائے، اس لئے انہوں نے مسلم نوجوانوں کو شراب کا دلدادہ بنانے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے، لہذا شراب نوشی کے نتیجہ میں مسلم نوجوانوں کے عزم وارادے ڈھیلے پڑ گئے اور ان کے حوصلے بکھر گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا رعب ودبدبہ ان کے قلوب سے کافور ہو گیا، پھر دشمن ان پر ٹوٹ پڑے اور ان پر پے در پے حملے بھی کئے، جس سے مسلمانوں کے اسلامی قلعے گرجا گھروں میں تحویل ہو گئے، اور آخر کار اندلس کے مسلمانوں کا سب سے آخری قلعہ غرناطہ یکم اپریل کو عیسائیوں کی تحویل میں چلا گیا اور ان کا تسلط قائم ہو گیا۔

مغرب کی اندھی تقلید میں ہم بے سوچے سمجھے جن رسموں کو انجام دیتے ہیں ان میں سب سے گھناؤنی ایک رسم اپریل فول (April Fool) منانے کی ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے کہ اپریل کی پہلی تاریخ کو جھوٹ بول کر یا دھوکہ دے کر کسی کو بھی بیوقوف بنایا جائے، اس کی قباحت اور سنگینی ہر صاحب عقل ونظر پر عیاں ہے، اور کسی مسلمان کے لئے اپریل فول نہ تو جائز ہے کیوں کہ جھوٹ ایک ایسا گناہ ہے جس کا ناجائز ہونا ہر شریعت میں مسلم ہے، مگر افسوس قوم مسلم بس دوسروں کی عادات واطوار کی رو میں بہی چلی جا رہی ہے، امام ربیع نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "من روع مسلما روعه الله يوم القيامة" جس نے کسی مسلمان کو خوف زدہ کیا اللہ اسے روزِ محشر خوف زدہ کرے گا۔

اسپین کے عیسائیوں کا مقصد عظیم یکم اپریل کو جب پورا ہوا، تو وہ اس دن کو بطور جشن کے منانے لگے، جس میں ایک دوسرے کو وہ باتیں سناتے جو وہاں کے شکست خوردہ مسلمانوں کی تحقیر وتذلیل کا سبب بنتیں۔

شروع میں یکم اپریل کو "خدعة ابريل" کا نام دیا گیا، اور یہ اشارہ تھا کہ مسلمانوں کو اس طرح دھوکہ دیا گیا تھا، کہ انہوں نے اپنی سلطنت سے تہی دست ہو کر راہِ فرار اختیار کی تھی۔

کیا اپریل فول منانے والے سادہ لوح انسانوں کو معلوم نہیں کہ ان کے آباء واجداد نے سرزمینِ اندلس پر کس شان بان سے حکومت کی تھی؟ اندلس میں جہاں آٹھ سو سالوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی تھی، ۱۰۶۰ء کے بعد ایک مسلمان بھی باقی نہیں رہا.....(بقیہ صفحہ نمبر ٦٤ پر)

نقطۂ نظر

نہ کر تقدیر کا شکوہ.....

محمد سراج الھدیٰ ندوی ازہری

دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

sirajazhari@gmail.com

اللہ تبارک وتعالی کا ایک نظام ہے، اس نے اپنے ازلی وابدی علم کی بنیاد پر سب کی تقدیریں لکھ دی ہیں، کسے کیا ملنا ہے؟ کہاں ملنا ہے؟ کتنا ملنا ہے؟ اور کیسے ملنا ہے؟ لیکن اس نے خاص مصلحتوں کی وجہ سے تقدیریں عیاں نہیں کیں، بلکہ اچھے اور بُرے دونوں راستے بتادیئے، پھر فرمایا جو جیسا کرے گا ویسا پائیگا "کل نفس بما کسبت رھینة" ہر شخص اپنے اعمال کے بدلہ میں محبوس ہوگا (المدثر:۳۸) اور فرمایا "فمن یعمل مثقال ذرة خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرة شر یرہ" سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (الزلزال:۷)

خدا کا فیصلہ صحیح فیصلہ ہوتا ہے، وہ اپنی مخلوق کے لئے کبھی برا نہیں چاہتا، اس کے نزدیک کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں، سب کی قدریں برابر ہیں، ساری کائنات اس کی مخلوق ہے، اس سے سب سے زیادہ قریب وہ ہے جو اس کی بات سب سے زیادہ مانے، اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے، اور اپنے دل ودماغ کو حسد وبغض، کفر ونفاق اور کینہ وکپٹ سے پوری طرح پاک رکھے، اسی لئے اس نے ہمیں غور وخوض کرنے کے واسطے عقل وشعور کی دولت سے مالا مال کیا، تاکہ ہم حق کو جان سکیں اور اچھے برے میں فرق کرسکیں، ہاتھ دیئے تاکہ کام کرسکیں اور دوسروں کے کام آسکیں، آنکھیں دیں تاکہ صحیح اور درست راستہ دیکھ سکیں، کان دیئے تاکہ اس (خدا) کے احکامات سن سکیں، پاؤں دیئے تاکہ چل کر رزق کی تلاش کرسکیں اور دین کی دعوت چہار دانگ عالم میں پھیلا سکیں، ان سب کے ساتھ ساتھ اپنے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبعوث فرمایا کہ ہم اپنی زندگی ان کی زندگی کے مطابق ڈھال سکیں .....خدا کا نظام ہے، اس نے کسی کو چھوٹا اور کسی کو بڑا بنایا، کسی کو بڑھاپے تک رکھا اور کسی کو جوانی ہی میں اٹھالیا، کسی نے جوانی کی رنگینی دیکھی اور کوئی بچپن ہی میں چل بسا، کسی نے والدین کی گود میں پرورش پائی اور کوئی یتیم ہوکر رہا، کوئی مال ودولت کی ریل پیل میں جیتا رہا اور کوئی مجبور ولاچار ہوکر دوسرے کے کندھے کا بوجھ بنا رہا.....آخر ایسا کیوں؟ یہ سب خدا کی قدرت ہے، وہ جو بہتر سمجھتا ہے کرتا ہے، ان میں ہمارا اور آپ کا کوئی اختیار نہیں، کیوں کہ وہ حکیم بھی ہے اور حاکم بھی، اس کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہی اس کے اوپر کسی کا اختیار چلتا ہے، اگر ہم اس (اللہ) کی قربت چاہتے ہیں تو اس کی بات مانیں، قریب ہوجائیں گے، اس میں

(ان شاء اللہ) ہماری دنیاوی وجسمانی کوئی شئی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ یوں سمجھئے کہ اس نے ہماری قسمت یہ کہہ کر بنائی کہ دیکھو اچھے برے دو الگ الگ راستے ہیں، اچھا کروگے اچھی قسمت والے ہوگے اور اچھے نتائج برآمد ہوں گے، غلط کروگے بُری قسمت والے ہوگے اور آج نہ تو کل برے نتائج ضرور ظاہر ہوں گے، وہ کسی پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا، اس کا فرمان ہے "**من عمل صالحاً فلنفسه ومن أساء فعليها وماربک بظلام للعبيد**" جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کیلئے اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال اس پر پڑے گا اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ (حم السجدہ:۴٦)

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ خدا نے ہمیں مجبور محض بنا کر نہیں بھیجا بلکہ اچھا برا، صحیح غلط اور دوست ودشمن پہچاننے کی سوجھ بوجھ عطا کی، اس نے ہمیں تعلیم دی کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا جائے، محنت سے کام کیا جائے، اگر کوئی شخص وقتی پریشانی ومصیبت کو دیکھکر اپنی قسمت کا رونا روتا ہے اور سست وکاہل بنا رہتا ہے، منھ لٹکائے پھرتا ہے، وہ حقیقت میں اپنی زندگی کا خون کررہا ہے اور وہ خدا کے نزدیک مجرم ہے کیوں کہ وہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کررہا ہے۔

انسان کو چاہئے کہ وہ صحیح راستہ پر گامزن رہے، حقیقت سے کبھی منھ نہ موڑے، حلال وپاکیزہ رزق کی تلاش میں کوشاں رہے اچھا انسان بننے کی ہمیشہ کوشش کرے اور اس کے لئے محنت ولگن سے کام لے، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ منزل بہت دور نظر آتی ہے لیکن چلنے والا ہمت نہیں ہارتا اور اپنے جہد مسلسل کے ذریعہ مقصد کو پالیتا ہے......لیکن اس کے برعکس کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، انسان صحیح راستے پر چل رہا ہوتا ہے، بہت زیادہ محنت ومشقت بھی کرتا ہے لیکن وہ چاہتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے، وہ بننا کچھ اور چاہتا ہے اور بن کچھ اور جاتا ہے، اس صورت میں اسے صبر سے کام لینا چاہئے اور خدا پر توکل کر کے اسی میں اپنے لئے خیر سمجھنا چاہئے، واویلا مچانا اور شور وغوغہ کرنا بے سود ہے، یہ تو بزدلی وکم ہمتی کی بات ہے اس پر گناہ تو مل سکتا ہے لیکن ثواب ملنے کی کوئی امید نہیں۔

دولفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسان ہمیشہ جہد مسلسل اور عملِ پیہم کے ذریعہ صحیح راستہ اپنائے رہے، عارضی نتائج سے بالکل نہ گھبرائے، اگر بظاہر اچھے نتائج نہیں معلوم ہو رہے ہیں تو صبر سے کام لے، اللہ سے دعا کرے، اسباب وعلل پر دوبارہ غور کرے، ہمت نہ ہارے، آج نہ تو کل آپ کی محنت ضرور پھل لائے گی، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کی چاہت پوری نہ ہونا ہی آپ کے لئے بہتر ہو"**عسى أن تكرهوا شيئا وهو خير لكم وعسى أن تحبوا شيئا و هو شرلكم، والله يعلم وأنتم لا تعلمون**" اور یہ بات ممکن ہے کہ کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خرابی ہو اور اللہ تعالی جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔(البقرہ:۲۱٦)

آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، محنت ولگن سے کام کیجئے، ایمان داری پر قائم رہئے، خدا کا ہر حال میں شکر ادا کیجئے اور صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہئے......آپ کا صحیح راستہ اختیار کرنا، آپ کی اچھی قسمت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور غلط راستہ اختیار کرنا آپ کی ناکامی کو بتاتا ہے جسے آپ آج نہ تو کل بری قسمت کا نام دیں گے، لہٰذا

نہ کر تقدیر کا شکوہ مقدر آزماتا جا
ملے گی خود بخود منزل قدم آگے بڑھاتا جا

☆☆☆

نقد ونظر (قسط-۲)

راشد شاز- ایک مطالعہ

مولانا الیاس نعمانی ندوی

راشد شاز کی موجودہ فکر کا حاصل اور لب لباب یہ ہے کہ وہ دین جو رسول اللہ (ﷺ) پر نازل ہوا تھا، اب محفوظ وموجود نہیں ہے، حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سے یعنی عہد صحابہؓ سے ہی ''اب تک ہم مسلمان ماخذ وحی سے مسلسل دور ہوتے گئے''، (۱) اور پھر ان شخصیات نے جنہیں مسلمان اپنے عظیم ائمہ اور سلف صالحین سمجھتے ہیں دین میں ایسی تحریف کی کہ وہ ''ایک منجمد اور بے روح مذہب'' (۲) ہوگیا، ان کے نزدیک دین کے محفوظ نہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ وہ نماز جسے مسلمان رسول اللہ (ﷺ) کے زمانے سے اب تک روزانہ پانچ بار اجتماعی طور پر پڑھتے ہیں، اور جس کی تعلیم رسول اللہ (ﷺ) نے اپنے لاکھوں صحابہ کو اور صحابہ نے اگلی نسل کے کروڑوں افراد کو اور پھر ہر نسل کے مسلمانوں نے اپنی اگلی نسل کے کروڑوں، اربوں افراد کو دی، یعنی جس پر امت کے تواتر اور تعامل کی ایسی مہر ثبت ہے جو کسی اور رکن اسلام پر بھی نہیں ہے، اس نماز کے بارے میں بھی شاز صاحب نے اپنی تحریروں میں متعدد مقامات پر تحریر کیا ہے کہ وہ اب محفوظ نہیں رہی، ان کا کہنا ہے کہ رسول اکرم (ﷺ) اور خلفاء راشدین کے عہد کی نماز کچھ اور تھی، اور آج کی نمازیں اس سے مختلف ہیں، ان کا کہنا ہے کہ نماز کے موجودہ طریقے محرف اور محدثین وفقہا کے خود ساختہ ووضع کردہ ہیں، (۳)۔یعنی ان کے نزدیک ابتدائی صدیوں میں نماز جیسی عبادت تک میں (جس کے محفوظ ہونے کی دلیل ایسا عملی وقولی تواتر ہے جیسا تواتر وتعامل تاریخ مذاہب میں کسی بھی عبادت یا حکم پر نہیں پایا جاتا) تحریف کردی گئی اور لوگ اپنی طرف سے روایتیں گڑھ کر اس میں تبدیلی کرتے رہے، اور پوری امت مسلمہ نے اس تحریف کو اس طرح قبول کرلیا کہ کسی کو 'اصل نماز' کی حفاظت کا خیال نہیں آیا، اور پورے عالم اسلام میں کسی ایک شخص نے بھی اس کے خلاف لب کشائی کی ضرورت نہیں سمجھی، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار اس کا ادراک شاز صاحب کو ہوا ہے، یقیناً وہی ہیں جو اس طرح کی باتیں کرسکتے ہیں۔

جو امت اپنے دین کی حفاظت میں اس طرح ناکام ہوجائے کہ وہ نماز تک کی حفاظت نہ کرسکے تو اس امت پر جو حکم بھی لگادیا جائے کم ہے، یہی وجہ ہے کہ شاز صاحب نے امت مسلمہ کی بابت یہ فیصلہ سنادیا ہے کہ وہ اب خیر امت نہیں رہی، 'مغضوب علیہم' ہوگئی ہے، (۴) شاز صاحب نے اس سے بھی آگے بڑھ کر پوری امت کو مشرک قرار دے دیا ہے، اپنی کتاب اسلام، مستقبل کی بازیافت میں بلا استثنا پوری امت کے خلاف تکفیری فتویٰ ان الفاظ میں صادر کیا گیا ہے:

''مسلمان مجموعی طور پر شرک کے گرداب شر میں گرفتار ہیں، سیادتِ عالم کے منصبِ جلیل سے ان کی معزولی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ توحید خالص کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے'' (۵)۔

اپنی کتاب ''متحدہ اسلام کا منشور'' کا آغاز ہی شاز صاحب نے قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے ان جملوں سے کیا ہے:

''کیا آپ مسلمان ہیں؟ اے کاش کہ اس سوال کا جواب اثبات میں ہوتا، لیکن اسے ہماری بدقسمتی کہیے کہ فی الواقع ایسا ہے نہیں'' (۶)

اسلام محفوظ نہیں رہا، اور تمام مسلمان مشرک ہیں، فکر شاز کے ان عناصر کو جان لینے کے بعد مساجد اور مدارس کی بابت ان کا یہ نظریہ بھی پڑھ لیجیے:

''مسجدیں ہوں یا مدرسے، بظاہر ان پر دینداری کا کتنا ہی خوشنما ملمع کیوں نہ چڑھا ہو اور ان کے میناروں سے اللہ اکبر کی صدا کیوں نہ سنائی دیتی ہو..... دراصل توحید کے مراکز نہیں بلکہ شرک اور بت پرستی کے اڈے ہیں'' (۷)

اب چونکہ یہ ثابت کرنا ہے کہ دین اسلام محفوظ نہیں رہا، اور جس امت کو امت مسلمہ سمجھا جاتا ہے وہ شرک میں مبتلا ہے، اس لیے شاز صاحب نے اپنے لیے یہ لازم سمجھا ہے کہ وہ اسلامی تاریخ میں حفاظت دین کی سنہری خدمتوں کو داغدار کرکے کسی طرح یہ ثابت کریں کہ امت کا جن ہزاروں اور لاکھوں شخصیتوں کی بابت یہ خیال ہے کہ انہوں نے حفاظت دین کی خدمت انجام دی ہے اور ان کی ہی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ آج تک یہ دین من وعن محفوظ ہے، وہ خادمان ومحافظین دین نہیں بدترین محرفین تھے، انہوں نے دین کی حفاظت وخدمت کا کام نہیں کیا بلکہ ''اسلام جیسے حیات افزا دین کو ایک منجمد اور بے روح مذہب میں تبدیل کردیا''، (۸) اور اپنے حلقوں کی فقہی آرا کو استناد بخشنے کے لیے اپنی جانب سے روایات واحادیث بھی وضع کردیں، (۹)۔ بلکہ حد تو یہ ہے کہ شاز صاحب نے جھوٹ بول کر یہ بھی ثابت کرنا چاہا ہے کہ تحریف اور تبدیلی کا یہ کھیل عہد صحابہ سے ہی شروع ہوگیا تھا، اور بعض صحابہ نے بھی احادیث وروایات میں من گھڑت اضافے کیے تھے، انہوں نے مشہور صحابی رسولؐ حضرت زبیرؓ کی جانب منسوب کرکے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ آں حضرتؐ نے مشہور حدیث **من کذب علیَّ**..... میں **'متعمداً'** کا لفظ ارشاد نہیں فرمایا تھا، لوگوں (صحابہ) نے اپنی جانب سے اس کا اضافہ کردیا ہے۔ (۱۰) یعنی جن صحابہ نے اس روایت کو یوں نقل کیا ہے: **"من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار"** شاز صاحب کے بیان کے مطابق حضرت زبیرؓ کے نزدیک وہ محرف ووضاع تھے، لیکن کمال ہے کہ حضرت زبیرؓ کی طرف منسوب اس قول کا کوئی حوالہ شاز صاحب نے نہیں دیا ہے، راقم نے بعض ذرائع سے شاز صاحب سے اس کا حوالہ دریافت کرایا تو انہوں نے خاموشی ہی کو غنیمت جانا، اور کوئی حوالہ مہیا نہیں کرایا، میں نے اپنی سی ہر کوشش ایسی کسی صحیح، ضعیف یا موضوع روایت کی تلاش کی کی، لیکن ایسی کوئی روایت نہیں ملی، حضرت زبیر کی طرف بظاہر اس خودساختہ روایت کو منسوب کرکے صحابہ کی جماعت پر کس قدر بڑی تہمت لگائی گئی ہے اس کے ادراک کے لیے یہ جاننا مفید ہوگا کہ ایک تحقیق کے مطابق ستر سے زائد صحابۂ کرام نے **"من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار"** کے الفاظ کو روایت کیا

ہے، (۱۱) یعنی شاز صاحب نے حضرت زبیر کی جانب ایک ایسی بات منسوب کر کے جو انہوں نے فرمائی ہی نہیں، اور جس کا تذکرہ (ہمارے علم کے مطابق) مصادر میں کہیں ملتا ہی نہیں ہے، ستر سے زائد صحابہ پر حدیث نبوی میں اپنی جانب سے اضافہ اور تحریف کی تہمت لگائی ہے، طرفہ یہ ہے کہ حضرت زبیر بھی اس حدیث کو روایت کرنے والے صحابہ میں سے ہیں اور خود ان کی روایت میں بھی "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار" کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں (۱۲)، اور اس سے بھی بڑھ کر طرفہ یہ ہے کہ ادراک زوال امت جلد اول میں کی گئی اپنی اس دروغ گوئی کے بعد جب شاز صاحب نے متحدہ اسلام کا منشور تصنیف کی تو اس میں "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار" کے الفاظ کو ایک مستند حدیث کے طور پر نقل کیا، (۱۳) سچ ہے کہ دروغ گو کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔

بہر حال شاز صاحب نے اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے کہ دین محفوظ نہیں ہے پورا ایڑی چوٹی کا زور اس بات پر لگا دیا ہے کہ جن علوم کی بابت امت یہ سمجھتی ہے کہ ان کے ذریعہ دین کی حفاظت ہوئی ہے اور ان علوم کے حاملین نے حفاظت دین کی خدمت دی ہے وہ علوم خود دائرۂ شک میں ہیں اور ان کے حاملین نے کھلی خیانتیں کی ہیں، دین میں تحریف کی ہے اور اسے 'کچھ کا کچھ' بنا دیا ہے، ان علوم میں چونکہ حدیث وفقہ کا ممتاز مقام رہا ہے، اس لیے شاز صاحب کے یہاں علم حدیث ومحدثین اور علم فقہ وفقہا پر شدید و بے جا تنقیدیں کی گئی ہیں، اور ان تنقیدوں میں دروغ گوئی، بہتان تراشی اور تلبیس سے اجتناب کی کوئی ضرورت انہوں نے نہیں سمجھی ہے، جس کے کچھ نمونے اگلے صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

حواشی

(۱) اسلام، مستقبل کی بازیافت، از: راشد شاز، ص: ۱۴، مطبوعہ ملی پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۵ء

(۲) متحدہ اسلام کا منشور، از: راشد شاز، ص: ۱۴، مطبوعہ ملی پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۲ء

(۳) نماز کی بابت شاز صاحب کے ان خیالات کے لیے ملاحظہ ہو: ادراک زوال امت، از: راشد شاز: ص: ۱/۲۳۵-۲۳۲، ۱/۳۸۱-۳۸۰

(۴) ملاحظہ ہو: ادراک زوال امت: ۱/۷۵، ۷۸-۸۱

(۵) اسلام، مستقبل کی بازیافت، ص: ۶۱

(۶) متحدہ اسلام کا منشور: ص: ۱۳

(۷) ایضا، ص: ۱۵

(۸) متحدہ اسلام کا منشور، ص: ۴۰

(۹) اس رائے کا اظہار شاز صاحب نے متعدد مقامات پر کیا ہے، مثال کے طور پر ان کا نماز کی بابت وہ کلام ملاحظہ ہو جس کا حوالہ ہم پیچھے دے آئے ہیں

(۱۰) ملاحظہ ہو: ادراک زوال امت، ۱/۲۰۵

(۱۱) نظم المتناثر من الحدیث المتواتر، از: محمد جعفر کتانی، مطبوعہ: دار المعارف، حلب، ص: ۲۰-۲۴

(۱۲) مثلا ملاحظہ ہو: مسند احمد، مسند زبیر بن العوام

(۱۳) متحدہ اسلام کا منشور ص: ۶۰

(جاری.....)

☆☆☆

ھندو ادبیات

قدیم ہندو ادبیات میں آنحضرت کا تذکرہ

از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
ترتیب وپیشکش ابوذر شیبان استھانواں نالندہ

ذیل کا مضمون حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ کا ایک قدیم مضمون ہے، جو دارالعلوم دیوبند کے ترجمان "الرشید" (شوال ۱۳۳۶ھ) میں مولانا کے دور ادارت میں شائع ہوا تھا، مولانا نے آج سے ایک صدی قبل اس مضمون میں جن باتوں کا تذکرہ کیا تھا اب وہ اظہر من الشمس ہو چکی ہیں۔ معمولی ترمیم و ترتیب کے بعد یہ مضمون نذر قارئین ہے۔: شیبان۔)

عبرانیوں کے صحائف و زبر میں سرور کائنات ﷺ کے متعلق مبشرانہ پیشین گوئیاں موجود ہیں، انصاف پسندوں کے نزدیک وہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے، خصوصا تورات و انجیل میں آپ کے ذکر مبارک کا موجود ہونا مسلمانوں کے عقائد میں داخل ہے، کہ نص قطعی سے خدا نے اس کی خبر دی ہے: "یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والنجیل" (ان کا نام لکھا ہوا توریت وانجیل میں پاتے ہیں)

الغرض مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کے پیدا ہونے کی بشارتیں گذشتہ انبیاء واولیاء نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ دی ہیں۔

مسلمان جب ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوئے تو اس خیال کو بھی ساتھ لائے، ادھر ہندوؤں کو دیکھا کہ وہ بھی اپنے یہاں کسی کتاب کے اترنے کے مدعی ہیں، گوان کے اکثر خصائل وعادات، خصوصا مشرکانہ رسوم وعبادات اس دعوے کی تکذیب کرتے تھے، لیکن پھر بھی ان میں بعض چیزیں ایسی پائی جاتی تھیں جن میں نبوی تعلیمات کی جھلک نظر آتی تھی، حتی کہ بعض وجوہات کی بنا پر بعض اکابر اسلامیین نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "ہندوؤں میں کوئی پیغمبر ضرور کتاب لے کر آیا، لیکن بعد کو تصویر کشی سے متجاوز ہو کر یہ بت پرستی میں مبتلا ہو گئے" ترجمہ خط مرزا مظہر جان جاناںؒ، از بشارات احمدیہ ص ۷)

مرزا مظہر جان جاناں کے علاوہ اور بھی بعض بزرگوں نے یہی لکھا، مثلا شاہ ولی اللہؒ صاحب وشاہ عبدالعزیزؒ صاحب وغیرہم۔

الحاصل مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ہندو مذاہب اور اس کی کتابوں کے متعلق اگر یقین نہیں تو ظن راجح ضرور رکھتا تھا کہ ان کی کچھ اصلیت ہے، گو زمانہ کی دست بردار اور شیطانی تصرفات کی بدولت آج ان کی صورت خراب ہو گئی ہے، اور یہود ونصاری کی کتابوں کی طرح وہ بھی تحریف وتبدیل کی قینچیوں سے مجروح ہو چکی ہیں۔

یہی طائفہ تھا جس کو ولولہ پیدا ہوا کہ جس طرح ہم کو یہود اور عیسائیوں کی محرف شدہ منسوخ کتابوں میں ہمارے

پیغمبر ﷺ کے اوصاف و بشارات مل جاتے ہیں، اسی طرح ہندوؤں کی کتابوں میں بھی ڈھونڈنا چاہیے، اگر ان کتابوں کا واقعی کوئی آسمانی تعلق ہے تو ممکن ہے کہ ان میں حضور ﷺ کا تذکرہ نکل آئے اس باب میں گذشتہ ایام میں بہت زیادہ کوششیں ہوئیں ہیں، مختلف ارباب علم نے اس پر مستقل رسائل لکھے ہیں جس میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ: ''ہندو کتابوں میں بھی آں حضرت ﷺ کا تذکرہ موجود ہے اور نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ موجود ہے''

خصوصا ایک بزرگ گیارہویں صدی میں گذرے ہیں جن کا نام عبدالرحمٰن چشتی مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سنسکرت زبان میں مہارت پیدا کی تھی، وہ اس دعوی کے سب سے بڑے حامیوں میں شمار کئے جاتے ہیں، انہوں نے ایک مستقل رسالہ ''مرآۃ المخلوقات'' کے نام سے اسی موضوع پر لکھا ہے، اسی طرح مجھے اطلاع ملی ہے کہ کوئی صاحب مولوی محمد حسن ہیں جنہوں نے اس باب میں دو مستقل رسالے لکھے ہیں، ایک کا نام ''تصدیق الہنود'' اور دوسرے کا نام ''کشف الاستار'' ہے۔

بہر حال مختلف ایام میں ان مسلمانوں نے اس کی کوشش کی، اور بقول ان کے اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں، ہم چونکہ خود زبان سنسکرت سے چنداں واقف نہیں اس لئے براہ راست اس کی تحقیق سے عاجز ہیں۔

ہمارے سامنے ایک رسالہ ''بشارات احمدیہ'' کے نام سے رکھا ہوا ہے اس کے مولف مولوی عبدالعزیز بن غلام جمال الدین ہیں، انہوں نے ۱۲۷۲ھ میں اس رسالہ لکھ کر دہلی کے مطبع یوسفی میں چھپوایا ہے۔

مولوی عبدالعزیز نے اس کتاب میں مولوی عبدالرحمٰن چشتی و مولوی محمد حسن کی کتابوں سے مضامین اخذ کئے ہیں، لیکن بیان ژولیدہ ہے، اور ساتھ ہی ایسی باتیں بیچ در بیچ درج ہیں جن کو موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہم اسی کتاب سے ان باتوں کو چن لیتے ہیں جن سے موضوع مبحوث عنہ پر خاص اثر پڑتا ہو۔

پہلی بشارت مہادیو کی

مولوی عبدالرحمٰن چشتی کا بیان ہے کہ یہ بشارت ہندووں کے مشہور بزرگ ''لشبت جی'' کے ملفوظات ''اترکھنڈ'' میں موجود ہے، لشبت نے ان باتوں کو مہادیو سے سنا، جبکہ وہ کیلاس پہاڑ پر اپنی بیوی ''پاربتی'' کے ساتھ گوشہ گزیں ہوگیا تھا، اور لشبت کے ان ملفوظات کے جمع کرنے والے بھی ہندووں کے مشہور بزرگ سونت اور سونگ ہیں، بہر حال اترا کھنڈ کے ان ملفوظات کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''ایک دن پاربتی مہادیو کے ساتھ کیلاس پہاڑ پر بیٹھی ہوئی تھی، مہادیو کو خوش دیکھ کر اس نے ان سے پوچھا کہ: آپ نے فرمایا تھا: ''دواپر زمانہ کے اخیر میں اللہ تعالیٰ جو بڑا حکمت والا اور بڑا قدرت والا ہے ایک شخص کو پیدا کرے گا جو ساری دیوی وغیرہ کو فنا کر کے زمین میں اپنا قبضہ کرے گا، جس وقت سے میں نے یہ بات سنی ہے مجھے بہت حیرت ہے آپ حقیقت کو بیان فرمائیے''

مہادیو نے انکار کرنے کے بعد ایک طویل داستان چھیڑی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان نہ تھا یعنی اس نے آدم علیہ السلام سے قصہ شروع کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین سے جنوں کو نکال کر انسانوں کو آباد کریں گے، اس کے بعد وہ انسانوں کے عروج وزوال، پیغمبروں کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچا کہ: ''چھ ہزار سال کے بعد مندر کے (جس کا ترجمہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے مکہ کیا ہے) ملک میں کہ دریا کے درمیان میں وہ زمین واقع ہے، وہ بڑا قادر ایک عجیب طرح کی مخلوق آدمؑ کی اولاد میں پیدا کریگا، جس زمین میں وہ پیدا کرے گا وہ زمین لائق بشن کے یعنی جگہ

اس بڑے قادر کی ہوگی'' (بیت اللہ کا ٹھیک ترجمہ یہی ہے۔)

اس جملہ پر پاربتی نے مہادیو سے پوچھا کہ جس شخص کو وہ قادر اس طرح کی برکت والی جگہ میں پیدا کرے گا وہ شخص دیوتا کے گھر یا کہسر کے گھر میں یا کس جگہ پیدہوگا: صاف بیان فرمایئے''

اس کے جواب میں مہادیو نے کہا: ''اے پاربتی وہ کانت بھونجہ کی پیٹھ سے پیدا ہوگا'' اور جس عورت کے پیٹ سے پیدا ہوگا، اس کا نام سانک رکھیا ہوگا''

بشارت احمدی کا مؤلف کہتا ہے کہ ''کانت بھونجہ'' کے معنی مجھے معلوم نہیں، لیکن ''سانک رکھیا'' کے معنی آمنہ کے ہیں، لیکن آگے کر چل کر اس نے لکھا ہے کہ ''کانت'' کے معنی نور، ''بھوجنہ'' کے معنی مشغول رہنے والے کے ہیں یعنی خدا کی عبادت میں مشغول رہنے والا اور یہی معنی عبداللہ کے ہیں۔

اس کے بعد مہادیو نے کانت بھونجہ کی تعریف کی ہے، جو بہت زیادہ غیر مفہم ہے، لیکن اخیر میں ہے کہ ''وہ یعنی کانت بھونجہ سردار ہوگا اور اس کے تین بیٹے پیدا ہوں گے'' پھر جب چوتھا بیٹا پیدا ہوگا وہ مخلوق سے نہیں ڈرے گا اور نہایت شجاعت اور عرفان والا ہوگا، اور اس کا نام ''مہامت'' ہوگا۔

مولوی عبداللہ و مولوی عبدالعزیز نے اس مہامت کے لفظ کو محمد کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، مولوی عبدالعزیز کو شبہ ہوا ہے کہ حضور ﷺ تو اکلوتے تھے، مگر یہ مہادیو تو ان سے پہلے تین بھائیوں کی پیشین گوئی کرتا ہے پھر انہوں نے جواب دیا ہے کہ مسند ابو یعلی وغیرہ میں ہے کہ ''حضرت آمنہ نے کہا کہ محمد ﷺ میرے پیٹ میں آئے تو کوئی حمل میں نے ایسا نہیں اٹھایا جو آپ سے ہلکا ہو''۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ اور بچوں سے بھی حاملہ ہوئی تھیں، ممکن ہے کہ مہادیو نے اس طرف اشارہ کیا ہو، انہوں نے اور روایات بھی پیش کی ہیں، مہادیو نے اس کے بعد مہامت کی تعریف ان لفظوں میں شروع کی ہے:

''ان کی (مہامت کی) وضع کو دیکھ کر لوگ حیران رہیں گے، نئی طرح کا ان کا حال دیکھیں گے، وہ ختنہ شدہ ہوں گے، جب جوان ہوں گے تو سوا سر اور داڑھی مونچھوں کے اور کہیں زیادہ بال نہ ہوں گے کہ حجامت کی ضرورت ہو''

اور جو پوجا ان کی قوم کے لوگ کریں گے، وہ نہ کریں گے اور اپنی قوم سے کہیں گے کہ مجھ کو اس قادر وحدہ لاشریک کا یہی حکم ہے کہ اس طرح کی بے معنی پوجا مت کر، اور میں سوائے اللہ کی ذات پاک کے اور کسی کی طرف رجوع نہیں کرتا ہوں، تم میری تابعداری کرو اس وجہ سے ساری قوم ان سے جدا ہو جائے گی''

مہادیو کی بشارت کے الفاظ یہ ہیں، اگر واقعی اتر کھنڈ کوئی کتاب ہندووں میں موجود ہے تو مسلمانوں کو اس میں یہ باتیں تلاش کرنی چاہیں کہ اس تمام مجموعہ سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے متعلق خوشخبری ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

دوسری بشارت بیاس جی کے قلم سے

مولوی عبدالرحمٰن چشتی کا بیان ہے کہ ہندووں کے یہاں ایک دوسری کتاب ہے، جس کا نام ''بھوتک اوتر پران'' ہے، اس کا مؤلف مشہور ہندی رشی ہے، وہ اس کتاب میں لکھتا ہے ''کہ آئندہ زمانہ میں مہامت پیدا ہوں گے، ان کا نشان یہ ہے کہ ان کے سر پر بدلی سایہ کرے گی اور ان کے جسم کا سایہ نہ ہوگا اور مکھی ان کے جسم پر نہیں بیٹھے گی، ملک دنیا کے لئے کچھ تلاش نہیں کریں گے، ان کی سب تلاش دین کے لئے ہوگی، اور جو کچھ پیدا کریں گے، اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں گے، اور تمام عمر کم کھائیں گے، عرب کا سردار ان کا دشمن ہوگا، اور وہ اللہ کے دوست ہوں گے، وہ قادر توانا ان کو تیس ادھیا پران بھیجے گا۔

مولوی عبدالرحمٰن چشتی نے اس تیس ادھیا پران کو قرآن مجید پر محمول کیا ہے۔

گوشائیں جی کی بشارت:

مولوی عبدالعزیز ایک نومسلم طالب علم حسین نامی کی کتاب سے اسے نقل کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ طالب حسین فرخ آباد کے ایک نومسلم آدمی ہیں، انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے، اور اس میں آنحضرت ﷺ کی بشارت رامائن کے اخیر سے بالکنڈ نامی حصہ سے نقل کی ہے، جس میں گوشائیں بیان کرتا ہے (خدا جانے اس گوشائیں سے بالمیک مراد ہے یا کون شخص واللہ اعلم) اس کتاب میں بہت سی چوپائیاں بھاشاہی میں نقل کی ہیں، جن میں چند اشعار بھی ہیں:

راج سنیت بہو پریت دکھائے
آپن مت سب کا سمجھا ئے

(بادشاہی قاعدہ سکھائے، خوف اور محبت دونوں دکھائے اپنا دین سب کو سمجھائے)

نگم اگم سوی تیج اوپارا
تپی ابا اونمت مجھارا

(سمندر کے پھیلاؤ کے مانند انکا جلال ہوگا گرم ہوگا آدا ان میں بیچ سے)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح کمہار کے آوا میں بیچ میں آگ لگائی جاتی ہے اور ہر جگہ پھیل جاتی ہے اسی طرح ان کا دین پھیل جائے گا۔

تب لگ سمندرم چھے کوئے
بنا ''محمد'' پار نہ ہوئے

(یعنی تب خدا تک کوئی بغیر محمد ﷺ کی پیروی کے نہیں پہونچ سکتا ہے۔)

اس کے اخیر میں ایک شعر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تلسی داس کی نظم ہے، اگر ایسا ہے تو بشارت نہ ہوگی، بلکہ تصدیق ہوگی، وہ چوپائی یہ ہے:

ہر سمندرم نماں نہیں ہوئے
تلسی بچن ست ست کوئے

(اس کے بعد خدائی پیغام ہوگا، تلسی سچ سچ کہتا ہے)

مولوی عبدالعزیز اس بشارت کو مولوی محمد حسن کے رسالوں سے نقل کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ مولوی محمد حسن نے اتھر بن وید کی ایک لمبی عبارت نقل کی ہے، سنسکرت ہی کے حروف ہیں، پھر اس کو فارسی زبان میں لکھ کر ترجمہ کر دیا ہے، اس کے بعد مولوی عبدالعزیز خود بھی اس پوری عبارت کو نقل کرتے ہیں ہم اس سے صرف اپنا مدعا نقل کئے لیتے ہیں۔

یہ عبارت دراصل خدا کی حمد و تعریف میں ہے، تعریف کے اندر یہ جملہ بھی درج ہے، اصل عبارت فارسی حرفوں میں یہ ہے:

''ابوجیشمٹو، شریشٹن، پرمن پورتن، برہماہن الام الورسول محمد رہ کم برشی''

(پیدا کرنے والا، زور اور بڑا از ور آور، بڑا اللہ، پیدا کرنے والا رسول محمد ﷺ زور آور کا کون ہے؟

خیال کیا جاتا ہے، کہ اگر گذشتہ بشارتیں ہندو لٹریچر میں موجود نہیں ہیں، تو کم از کم اتھر بن وید کی یہ بشارت ضرور موجود ہے، کیوں کہ مولوی عبدالمجید راوی ہیں کہ اجمیر کے پنڈتوں کے سامنے یہ عبارت پیش کی گئی ہے، انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ اکبر بادشاہ کی بنوائی ہوئی عبارت ہے، مولوی عبدالعزیز نے اس کے مقابلہ میں یہ پیش کیا ہے، کہ پنڈت کنہیا نامی کے پاس اتھر بن وید کا نسخہ موجود ہے جو چھ ۶ سو برس کا لکھا ہوا ہے، اور اکبر کو تو ابھی چھ سو برس نہیں ہوئے ہیں۔

اسی طرح مولوی محمد حسن مؤلف کشف الاستار راوی ہیں ''شاہ پورہ علاقہ راجپوتانہ میں تو شرم رام نامی ایک پنڈت ہے، جس کے پاس گیارہ سو برس کا نسخہ لکھا ہوا موجود ہے، اور اس میں یہ منتر بھی موجود ہے، چونکہ اس مسئلہ میں ان اختلافات

وبیانات کی وجہ سے اہمیت پیدا ہوگئی ہے، اس لئے خاص طور سے قابل توجہ ہے۔

پانچویں بشارت ''کلکی اوتار''

تصدیق الہنود کے مصنف کا دعوی ہے کہ ہندو بزرگوں نے اپنے یہاں دس اوتار کا تذکرہ کیا ہے، جس میں بدھا اوتار اور کلکی اوتار کا تذکرہ بھی ہے، کلکی اوتار کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ آں حضرت ﷺ پر صادق آتے ہیں، کلکی معنی سیاہوں کا مٹانے والا، کلکی پران میں کلکی اوتار کے باپ کا نام وشنویس لکھا ہے، اور وشنو کے معنی خدا کے ہیں، اور ''یس'' کے معنی بندہ، پس مجموعہ ''عبداللہ'' ہوا، اور یہی حضور کے والد کا نام تھا، اسی طرح ماں کا نام ''سومتی'' لکھا ہے، اور سومتی کے معنی معتمدہ جس پر بھروسہ کیا جائے اور یہ وہ سچی ہے، دغا فریب نہ کرے گی، یہی معنی ہیں آمنہ کے یعنی امن و امان والی، اور جائے سکونت کا نام شنبل نگری لکھا ہے، اور یہ بھی حضور ہی پر صادق آتا ہے، کہ آپ مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اور وہ سمندر کے کنارے ہے، خود آپ کو حکم دیا گیا کہ اس شہر میں جاؤ جو سمندر کے کنارے ہے، اور آپ نے مدینہ ہجرت کی۔

آگے پران کا مصنف تیسری علامت لکھتا ہے کہ ''وہ غار میں تپشیا یعنی عبادت کرے گا'' یہ بھی ظاہر ہے کہ حضور ہی نے غار حرا میں عبادت کی۔

اس کے بعد چوتھی علامت یہ ہے کہ ''وہ پرش رام سے تعلیم پائیں گے'' پرش کے معنی روح، رام کے معنی خدا کے ہیں، یہی روح الامین حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔

پانچویں علامت یہ ہے کہ اسی ملک کے رئیس کی بیٹی اپنے وکیل کے معرفت آپ کو قبول کرے گی، حضرت خدیجۃ الکبری کی طرف اشارہ ہے۔

چھٹی علامت یہ لکھی ہے ''کہ وہ اپنے وطن سے ہجرت کر جائیں گے''۔

ساتویں علامت یہ ہے کہ ''وہ تمام پاک لوگوں کی تعریف کریں گے'' ظاہر ہے کہ آپ نے تمام نبیوں کی تقدیس و تعریف کی۔

آٹھویں علامت یہ ہے کہ ''ان کے ہاتھ میں تلوار ہوگی'' بے شک آنحضرت ﷺ نے جہاد کیا۔

نویں علامت تو کھلی ہوئی ہے کہ کلکی پران میں کلکی اوتار کی پیدائش کی تاریخ اور دن مہینہ، گھنٹہ تک دیدیا ہے، جو کل آنحضرت ﷺ پر صادق آتے ہیں، صرف اتنی بات ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ربیع الاول کی ۱۲ تاریخ کو سورج نکلنے کے دو گھڑی بعد پیدا ہوں گے، حالانکہ حضور ﷺ صبح صادق کو پیدا ہوئے، مؤلف تصدیق الہنود نے اس کا جواب دیا ہے کہ عرب اور ہندوستان میں اتنا فرق ہونا کوئی بعید بات نہیں، بلکہ ریاضی کے قاعدہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے صبح کے وقت ہندوستان میں دو گھڑی دن چڑھنا چاہیے، تصدیق الہنود میں پورے طور سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور زائچہ تیار کر دکھایا ہے کہ دونوں تاریخیں ایک ہیں، فعلی اللہ اجرہ۔

آنحضرت کا اسم مبارک وید میں:

کشف الاستار میں ہے کہ اتھر بن وید میں ''اللہ'' کا لفظ ہے، اور اسی طرح آنحضرت ﷺ کے دو مشہور نام ''احمد و محمد'' اس میں صاف طور پر اپائے جاتے ہیں، رکھ کھنڈ میں ''سری تو ام سرسموائی وکالی کامائی احمد نارابائی''

اسی طرح یجروید میں ہے ''الانک نخ والوجان محمد الانک کر مان جان بنجان تندمانی جان جان نماہی جیوسان کجان''

ان کہنی

عام طور سے مسلمانوں میں مشہور ہے، اور ''دبستان المذاہب'' والے نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے کہ اکبر کے

زمانہ میں ایک برہمن مسلمان ہوگیا تھا اور ہندوؤں سے کہتا تھا کہ اتھر بن میں یہ ٹکڑا موجود ہے۔

لا الہا ہرنی پاپن الا الہا پرم پدم
جنم بےکنٹھہ پراپ نیوتیتو جپی نام محمدم

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ لا الہ کہنے سے پاپ ہٹتے ہیں اور الا اللہ کہنے سے پرم پدوی ملتی ہے، جنم بے کنہٹی اگر چاہو تو نام محمد (ﷺ) کو ورد زبان کرو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چند اور شواھد

(۱) بشارات احمدیہ کے مولف نے اس کو مولوی سیف اللہ گورکھپوری کے مسودہ سے نقل کیا ہے، ان کے مسودہ میں تھا کہ یہ بشارت کھیل پر گرن کی کتاب سے ماخوذ ہے جو کندا کا مصنف ہے وہ اپنی کتاب کے ابتدائی حصہ میں بارہویں ادھیا کی چھٹی درشست کو نٹ میں لکھتا ہے:(اصل عبارت اردو حروف میں)

''ادت پن انتم مہی ندھم ارن سیکیا رتم، بلونت سورتم پرتھوی مدھیسر ب اونماسن گرام پرسن پر پرسوتھم دیوتا دھنکر مہت چھاک کورودم سن گرام تہ یسمجد سولین کوردڈہ''

(نجات دینے والا اوتار جو ہے وہ پیدا ہوگا اندھیری دور کرنے والی زمین کے بیچوں بیچ میں، دشمن کا مارنے والا، زور والا، بڑا بہادر، زمین کے ناف میں، وہ ''سرف انما'' ہوگا (اس لفظ کے معنی ہیں تعریف کیا گیا جو ترجمہ ہے محمد کا) بذریعہ جنگ کے دین کو پھیلائے گا، کوڑا مارنے والے کو لڑائی کے ساتھ پچھم کی طرف ہو ملے گا، اس کے ملنے کی دو شرائط ہوں گی، (۱) پیداوار زمین کی دیا کرو۔ (۲) ہمارا عقیدہ قبول کرو، وہ بڑی عزت والا ہوگا، راجہ بڑا راجہ، بڑے لوہے کی چلانے والی زمین کے بیچوں بیچ میں، بے وقوفی کا مٹانے والا پیدا ہوگا۔ زمین کے بیچوں بیچ میں اچھے لوگوں کے گھرانے میں جو بے عیب ہوں گے ان کا پیارا بیٹا، خدا کے قدم پاک میں روح رہی، مدت تک وہ آنے والا جب قدم چھوڑے گا آجائے گا پرانے گھر کی سرحد میں)۔

(۲) یہ بشارت کتاب ''سمرت وسما اسکنت'' سے جو ۸۳م سمرتیوں میں شامل ہے منقول ہے:

''مہا بھوی برنہ ہرنک پہری پوترین سارستی چرنہ سرسری گھم شرم نئی دہ پرزتھی، دم ایتی سارم بر ہارنم سودیہ پری پورنم اوتارنہ''

(زمین کے بیچوں بیچ میں جس طرح بڑے خاندان میں خدا کی طرف سے اوتار ہوگا اور اس ملک کا پتہ یہ ہے کہ وہاں ایک پتی ہوگی دست آور، اور اس ملک کے لوگ بوسیلہ ان کے پاک ہوں گے، حاصل کریں گے گناہوں سے نجات، وہ بڑا دریا دنیان کا دامن پکڑ کر پار اترے گی۔ اور اس سرزمین میں خدا کا پیارا خدا کے قدموں کو چھوڑ کر گرے گا۔ ان پہاڑوں پر گھاس نہ ہوگی، کچھ دیا کرو نہیں تو لڑو، ورنہ ہماری بات مانو (کہے گا) خدا کا نام ہی ان کے پاس جائے گا، ایک دفعہ اترے گا، گناہوں کا کاٹنے والا)

بشارات احمدیہ کے مؤلف نے اخیر میں لکھا ہے:''راج بھوج نے چاند کے دوٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھے تھے براہمنوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو انہوں نے کہا کہ ملک عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے کہا جاتا ہے کہ راج بھوج اس کے بعد مسلمان ہوگیا تھا، اس ماکن کا دربار تھا، یہ وہ مشہور مکان بھوج نہیں بلکہ اور ہے۔''

بہرحال متفرق طور سے میں نے بشارات احمدیہ سے یہ باتیں تحقیق وتفتیش کے لئے پیش کی ہیں، اس کے علاوہ میری غرض یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان دیکھیں کہ ان کے اسلاف ہندوستان کے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے کیا کیا محنتیں کرتے تھے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

قدیم اساتذہ کی شفقت و ایثار

م۔ق۔ن

زمانہ ماضی میں اساتذہ کو اپنے شاگردوں اور طالب علموں سے ایسا گہرا تعلق ہوتا تھا جس کی مثال عصرِ حاضر اور موجودہ نظام تعلیم میں ملنی مشکل ہے، اساتذہ اپنے شاگردوں کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے اکثر اوقات ان کے متکفل ہوتے تھے، ان کو خورد ونوش میں شریک کرتے تھے۔ عہد اکبری کے شاہی طبیب اور مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے متعلق ''تذکرہ علماء ہند'' کا مصنف لکھتا ہے کہ: پیوستہ طلبہ رادرس گفتے و بے ایشان طعام نخورد (ہمیشہ طلباء کو درس دیتے اور بغیر ان کے کھانا نہ کھاتے۔)

استاد الملک مولانا محمد افضل جونپوری کو اپنے طلباء سے ایسا تعلق تھا کہ جب ان کے مایہ ناز شاگرد ملا محمود جونپوری کا انتقال ہوا تو وہ اس صدمہ کی تاب نہ لا سکے، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں: تا چہل روز استاد را کسے متبسم نہ دیدہ و بعد چہل روز استاد بشاگرد ملحق شد (چالیس روز تک کسی نے استاد کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا، چالیس روز کے بعد وہ بھی اپنے عزیز شاگرد سے جا ملے)

تاریخ کی کتابوں میں یہ بھی رقم ہے کہ ملک العلماء مولانا عبدالعلی بحر العلوم کو جب منشی صدر الدین خاں نے بہار (بردوان) آنے کی تکلیف دی اور گراں قدر تنخواہ کی پیشکش کی تو مولانا نے عذر فرمایا کہ میرے ساتھ سو طالب علم ہیں جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ ہو میں آ نہیں سکتا، جب منشی صاحب نے ان کی ذمہ داری لی تو مولانا تشریف لے گئے۔

مدارس میں نواب والا جاہ نے مولانا کی ایک ہزار ماہوار تنخواہ مقرر کی جو تمام وکمال طلبہ پر خرچ ہو جاتی تھی، اور ان کے خاندان میں جو لکھنو فرنگی محل میں تھا اس کا کوئی حصہ نہیں پہونچتا تھا، اس کی وجہ سے ان کے صاحبزادے (مولانا عبدالنافع) نے مدراس کا سفر کیا اور بارہا والد محترم سے اس بارے میں گفتگو کی، لیکن مولانا نے اپنا طرز عمل ترک نہیں کیا، اور صاحبزادہ ناکام لکھنؤ واپس ہوئے۔

اس جیسے واقعات برصغیر کے اسلامی عہد کی تاریخ میں نادر نہیں ہیں، اس عہد اور نسل کے بھی بہت سے علماء نے اپنے اساتذہ کی شفقت و ایثار اور فراخ حوصلگی کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

اوپر قدیم اساتذہ کے جن واقعات کا ذکر کیا گیا اور ان اساتذہ کی شفقت وایثار اور فراخ حوصلگی نیز اپنے شاگردوں سے بے پناہ تعلق کی جن خصوصیات کا اظہار کیا گیا آج کے اساتذہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ آج کے اساتذہ کرام اسلاف کے ان واقعات سے سبق لیں اور اپنے اندر بھی ان قدیم اساتذہ کی صفات وخصوصیات کو پیدا کریں اور معلّمی اور مدرسی کے باوقار عہدے کا پاس ولحاظ رکھیں اور خود کو آنے والی نسل کے لئے آئیڈیل اور نمونہ بنائیں۔

جنہیں فضول سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلاؤ تو روشنی ہوگی

☆☆☆

(صفحہ نمبر ۵۱ کا بقیہ)

(صفحہ نمبر ۵۱ کا بقیہ)

اندلس میں مسلمانوں کے خاتمہ کی داستاں بڑی دردناک ہے۔ اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی (ا) (تفصیل کے لئے، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ ۳۵۰، از ثروت صولت)

اس درد بھری داستاں پر یہ مثل عام ہوگئی"یـــــا أمة ضـحـكـت من جهلها الأمم " (ہائے افسوس اس امت پر جس کی نادانی اور بیوقوفی پر دوسری قومیں قہقہہ زن ہیں)

یہ ہے اپریل فول کی وہ تلخ حقیقت جسے ہم گھونٹ گھونٹ پی رہے ہیں۔

اہل مغرب آج بذاتِ خود اس اپریل فول کی قباحت و شناعت کو ظاہر کرنے لگے ہیں، اور اس سے چھٹکارے کی راہ تلاش کررہے ہیں، اور اپنے آپ کو اس ناپاکی اور گندگی سے بچانے کے لئے کوشاں وسرگرداں ہیں، چار سال قبل فرانس کے اندر ایک ایسی جماعت وجود میں آئی، جس نے اپریل فول کی ایک لت قرار دیا، اور اس کے منانے والے کو بیمار زمانہ تصور کیا، اور اپریل فول کو مصیبتوں کا سرچشمہ گردانا، اس جماعت کے لوگوں نے عہدو پیاں کی اکہ اب اس گندگی کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ تو کہاں ہیں وہ لوگ جو اپریل فول کے دن فحش جھوٹ کی بنیاد پر اللہ کی لعنت اور اس کی ناراضگی کا سب سے بڑا حصہ بنتے ہیں، سچ ہے کہ ۔

مـــن يسهـل الهـــوان عـــليـــه
مـــا الـــجـــرح بـمـيـــت إيـلام

(جو ذلیل وخوار ہوجائے اس کے لئے ذلت سہنا آسان ہوجاتا ہے، مرہ زخم سے تکلیف کہاں ہوتی ہے اب

اخیر میں ہم اللہ کے حضور دست بہ دعا ہیں کہ اللہ ہمیں جھوٹ جیسی خصلت اور غیروں کی اندھی تقلید سے بچنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

جامعۃ البنات حیدرآباد
JAMIATUL BANATH HYDERABAD

شعبہ حفظ عالمیت، فضیلت

لڑکیوں کا اعلی و معیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ

شہر کے اہم مقامات سے بسوں کی سہولت

دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی وکمپوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔
عثمانیہ یونیورسٹی (اورینٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔
ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبۂ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔
(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)

والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم وتربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔

نوٹ: (ا) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اور کوئی شاخ نہیں ہے۔

صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:

JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)

پتہ: جیون یار جنگ کالونی، روبرو مدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی، سعید آباد، حیدرآباد۔
رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534
Website:www.jamiatulbanath.org